



Atlantis
Publications

محمود، فاروق، فرزانه اور
اشپکتر جمشید سیریز
ناول نمبر 23

انگوٹھی کا راز



اشتیاق احمد

اٹلانٹس پبلکیشنز صحت مند، اصلاحی اور دلچسپ کہانیوں اور ناولوں کی کم قیمت اشاعت کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول

انگوٹھی کا راز

نمبر

انسپکٹر جمشید سیریز 23

پبلشر

فاروق احمد

قیمت

35 روپے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اٹلانٹس پبلکیشنز کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل، کسی قسم کی ذخیرہ کاری جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں اور کسی بھی ذریعے سے ترسیل نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب اس شرط کے تحت فروخت کی گئی ہے کہ اس کو بغیر ناشر کی پیشگی اجازت کے، بطور تجارت یا بصورت دیگر مستعار دوبارہ فروخت نہیں کیا جائے گا۔

ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی خط و کتابت اور رابطے کیلئے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں۔

D-83 سائٹ - کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk

اٹلانٹس
پبلکیشنز

ایک حدیث

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
جو تیرے پاس امانت رکھے، اُس کی امانت اُسے
لوٹا دے اور جو تجھ سے خیانت کرے، تو اُس سے
خیانت نہ کر۔
☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- ☆ یہ وقت عبادت کا تو نہیں۔
 - ☆ آپ کو اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
 - ☆ آپ نے کسی کو وقت تو دے نہیں رکھا۔
 - ☆ آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے عبادت اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔
- اشتیاق احمد

لڑکی کے دشمن

پہاڑی راستوں پر وہ چھوٹی سی بچی بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ اس کا سانس بُری طرح پھولا ہوا تھا۔ سینہ لوہار کی دھونکی کی طرح پھول اور پچک رہا تھا۔ آنکھیں خوف کے مارے باہر کو اُٹلی ہوئی تھیں۔ چہرے کا رنگ سرخ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے موت تیزی سے اس کی طرف جھپٹ رہی ہو اور وہ موت سے بچنے کے لئے جان توڑ کر بھاگ رہی ہو۔

اس کے پیچھے تین لمبے تڑنگے نوجوان تھے۔ ابھی وہ اس سے کافی فاصلے پر تھے۔ ان کے چہروں پر بلا کی درندگی تھی جیسے وہ اس لڑکی کو چیر پھاڑ کر رکھ دینا چاہتے ہوں۔ وہ تینوں بے تحاشا بھاگ رہے تھے لیکن پہاڑی راستوں پر بھاگنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور پھر وہ لڑکی کے مقابلے میں بہت بھاری بھر کم تھے۔ لڑکی پتلی دُلی تھی۔ وہ ان کی نسبت زیادہ بھرتی دکھا رہی تھی۔ پھر بھی اس کے قدم ان لمبے چوڑے نوجوانوں سے چھوٹے تھے۔ اس لئے ہر لمحے ان کے درمیان فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک لڑکی کا پیر ایک ابھرے ہوئے پتھر سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور دوسرے ہی لمحے وہ اونڈھے منہ نیچے گری۔ اس نے اٹھنے کے لئے زور لگایا، اٹھی، دو قدم چلی اور پھر گر گئی، شاید اس کے گھٹنوں میں چوٹ آئی تھی۔

یہ دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر ایک ظالمانہ مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ ان کے لمبے

دوباتیں

السلام علیکم!

انگوٹھی کا راز کا سہنس آپ کو پوری طرح جکڑ لے گا۔۔۔۔۔ یہ جملہ میں نے اور بھی کئی ناولوں کے لئے لکھا ہے۔ لیکن اس ناول کے لئے بھی بلاوجہ نہیں لکھا۔۔۔۔۔ آپ پڑھ کر جان ہی لیں گے۔

دوسرا یہ کہ پڑھنے کے دوران میں آپ کو دعوت دیتا ہوں۔۔۔۔۔ آپ خود بھی انگوٹھی کا راز جاننے کی پوری پوری کوشش کریں۔۔۔۔۔ دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ ناول کے کون سے موڑ پر۔۔۔۔۔ یا کس مقام پر راز جان لیتے ہیں۔۔۔۔۔ اور اگر آپ اس سلسلے میں ایک ایک خط بھی لکھ دیں تو اور بھی حزر رہے گا۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ کے خطوط نئے ناول کے آخر میں شائع کئے جائیں گے۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں ضروری بات یہ ہے کہ پورا ناول پڑھنے سے پہلے ہی اپنی رائے لکھ کر بھیج دیجئے گا۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد ناول ختم کیجئے گا۔۔۔۔۔ اس طرح یہ ایک دلچسپ تجربہ ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اُمید ہے آپ ایسا کریں گے۔

نستین

لیکن لڑکی انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ اُن کے چہروں پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔
”ارے۔ وہ کہاں چلی گئی؟“ ایک کے منہ سے نکلا۔

”ابھی تو یہیں تھی۔“ دوسرا بولا۔

”معلوم ہوتا ہے، اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔“ تیسرے نے بھی خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا۔

”یار رشید، اگر وہ ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گئی تو ہم پچیس ہزار روپے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“

”ہاں، اور اس کا افسوس ہمیں ساری زندگی رہے گا۔“ رشید نے کہا پھر ایک دم بولا۔ ”نہیں ہم اسے بچ کر نکلنے نہیں دیں گے۔ شریف، تم ان جھاڑیوں میں اُسے دیکھو۔ انور دائیں طرف، میں بائیں طرف دیکھتا ہوں۔ اگر وہ کہیں نظر آجائے تو سیٹی بجا کر اطلاع دے دینا۔“
”اچھی بات ہے۔“ شریف نے کہا۔

”تینوں مختلف سمتوں میں آگے بڑھنے لگے۔ انہیں لڑکی کی طرف سے کوئی خطرہ تھا ہی نہیں، اس لئے وہ بغیر کسی احتیاط کے آگے بڑھ رہے تھے۔ تینوں کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ شاید انہیں ڈرتا تھا کہ کہیں لڑکی ان کے ہاتھ سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اگر علاقہ پہاڑی نہ ہوتا تو اس وقت تک وہ لڑکی پر قابو بھی پا چکے ہوتے۔ وہ تلاش کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کافی دور نکل گئے تھے لیکن لڑکی ابھی تک انہیں نظر نہ آئی تھی۔ اچانک شریف کے منہ سے او، کی آواز نکلی۔ جھاڑیوں میں اسے نیلے رنگ کا ایک ربن الجھا ہوا نظر آیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

”جہاں تک مجھے یاد ہے، اس نے بالوں کو نیلے ربن سے ہی باندھ رکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اب وہ بچ کر کہاں جائے

لے دانت دھوپ میں چمکنے لگے۔ انہوں نے بھاگنا بند کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھڑکے لڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔ لڑکی گردن موڑے خوفزدہ ہرنی کی مانند انہیں اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ہرن جھاڑیوں میں پھنس جائے اور شیر کو اپنی طرف آتا دیکھ لے۔

لڑکی نے مایوس ہو کر ایک نظر چاروں طرف ڈالی۔ دُور دُور تک کوئی نہ تھا جسے وہ مدد کے لئے پکارتی۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ نام تھا اعظم گڑھ۔ چھوٹی سی آبادی تھی اور وہ بھی غریب لوگوں کی۔ لوگ باگ اپنے اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے۔ ایسے میں کسی کو کیا خبر۔ کہ ان پہاڑیوں میں کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تینوں لڑکی کے بہت نزدیک پہنچ گئے۔ لڑکی کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اچانک وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس بار بھاگ کھڑی ہوئی۔ تینوں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ انکے خیال میں لڑکی میں اب بھاگنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ ایک بار پھر انہیں بھی لڑکی کے پیچھے بھاگنا پڑا۔ لڑکی پہلے کی نسبت زیادہ تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ شاید موت کے خوف نے اس میں نئی طاقت کی لہر دوڑا دی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ان کے سہارے اُڑی چلی جا رہی ہو، لیکن آخر کب تک۔۔۔ جلد ہی وہ پھر تھک گئی اور فاصلہ کم ہونے لگا۔

اچانک لڑکی نے اپنی جگہ سے ایک چھلانگ لگائی اور ابھری ہوئی ایک چٹان کے پیچھے جھک کر ایک طرف بڑھنے لگی۔ وہ ان تینوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی یہ بات ہے کہ ابھی ان سے دُور نہیں ہوئی تھی۔

اب اُس کا رخ چٹان کے ساتھ اُگی ہوئی جھاڑیوں کی طرف تھا۔ شاید وہ ان میں چھپ جانا چاہتی تھی، اور پھر یہی ہوا۔ وہ جھاڑیوں میں گھستی چلی گئی۔ جلد ہی اسے پچھا کرنے والے چٹان کے اس طرف پہنچ گئے۔ انہوں نے چاروں طرف دیکھا

تینوں اب لڑکی کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

اعظم گڑھ آئے ہوئے انہیں تین دن ہو چکے تھے۔ آتے ہوئے وہ خان رحمان سے ان کی کوٹھی کی چابی لے آئے تھے اور اس وقت اس کوٹھی میں موجود تھے۔ خان رحمان گرمیوں کے زیادہ تر دن اسی کوٹھی میں گزارتے تھے۔ یہ کوٹھی ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی اور اسکے چاروں طرف دور دور تک نیچے دیکھا جاسکتا تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ آتے ہوئے اپنی دور بین بھی ساتھ لے آئے تھے تاکہ پہاڑی علاقے کے مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ یہ دور بین انہیں پروفیسر داؤد نے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اس میں جوشیے استعمال کئے گئے تھے، وہ خاص قسم کے تھے اور اس میں سے بہت دور کے مناظر بھی بالکل اس طرح دیکھے جاسکتے تھے جیسے چند فٹ کے فاصلے سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس وقت بھی تینوں دور بین لئے بیٹھے تھے۔ انسپکٹر جمشید غسل خانے میں نہا رہے تھے۔ جبکہ بیگم جمشید باورچی خانے میں تھیں۔ دور بین، فاروق کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ وہ کوٹھی کی دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ان کے ارد گرد دور دور تک پہاڑیاں تھیں۔ ان پہاڑیوں پر سفیدے کے بلند بلند درخت لہلہا رہے تھے۔ خوش رنگ پھول عجب بہار دکھا رہے تھے۔ ایسے میں ان کی نوک جھونک جاری تھی۔

”میں کہتا ہوں، کیا ہم یہاں بیٹھے رہنے کے لئے آئے ہیں۔“ فاروق کہہ رہا تھا۔

”نہیں تو۔ بڑے شوق سے کھڑے ہو جاؤ۔ مجھے اور محمود کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیوں محمود؟“

”بالکل نہیں۔ بھلا اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، بڑے شوق سے یہ کھڑا

اس خیال کے آتے ہی اس نے سیٹی بجا دی۔ رشید اور انور چونک کر مڑے اور اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر انہیں اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ دو منٹ بعد ہی وہ اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔

”کیا بات ہے۔ کیا وہ تمہیں نظر آگئی؟“ رشید نے پوچھا۔

”ابھی تک تو نظر نہیں آئی۔“ شریف بولا۔

”تو پھر تم نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟“ انور نے منہ بنا کر کہا۔

”وہ دیکھو۔۔ ایک ربن جھاڑیوں میں الجھا ہوا ہے۔“ شریف نے انگلی سے

اشارہ کیا۔

”ربن۔ اوہ۔ تو کیا یہ اس کا ہے؟“ رشید نے چونک کر کہا۔

”میرا خیال تو یہی ہے۔“ شریف نے کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان جھاڑیوں میں چھپی ہوئی ہے۔ پھر تو ہم نے مارا

میدان۔ تین طرف سے ان جھاڑیوں میں اسے تلاش کرتے ہیں۔“ انور بولا۔

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“

جھاڑیاں تقریباً پندرہ بیس گز دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ان کے گرد تین طرف سے بڑھنا شروع کیا۔ اب وہ لمحہ بہ لمحہ ایک دوسرے سے نزدیک ہونے جا رہے تھے۔ پھر جو نرمی وہ جھاڑیوں کے درمیان پہنچے، لڑکی انہیں نظر آگئی۔

”وہ ر۔۔ اب یہ ہم سے فاصلہ کر کہیں نہیں جاسکتی۔“ رشید نے اچانک کہا۔

”اس کا مطلب ہے ہمارے پچیس ہزار روپے کھرے ہو گئے۔“ انور خوش ہو کر

بولا۔

”ہاں، اب اس میں کیا شک ہے۔“ شریف کے منہ سے نکلا۔

”میں نے اگر تمہیں دو ہاتھ دیئے تو سر پر ہاتھ رکھ کر دے دو گے۔“ فاروق مسکرایا۔
 ”بس لگ گئی ہاتھ کی۔“ فرزانہ نے جھنجلا کر کہا۔
 ”تو تم کیا چاہتی ہو۔ پیر پیر کی لگے۔“ فاروق بھلاکب چپ رہنے والا تھا۔
 ”ادھر لاؤ دور بین۔ یوں ہی اوٹ پناگ باتیں کرتے رہتے ہو۔“ فرزانہ نے جھنجلا کر کہا۔

”لو۔ تم دور بین سے ڈھنگ کی باتیں کرو۔“
 فاروق نے منہ بنا کر دور بین اس کے ہاتھ میں دے دی۔ فرزانہ نے اُسے آنکھوں سے لگایا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

”بھئی واہ، شاید یہ لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔“
 ”غلط سمجھے، دور بین میں مجھے ایک لڑکی بھاگتی نظر آ رہی ہے۔ تین لمبے تڑنگے آدمی اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔“ فرزانہ نے بتایا۔ دور بین بدستور اس کی آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔

”یہ کیسی آنکھ مچولی ہے۔ آنکھ مچولی تو ہم عمروں کے ساتھ کھیلی جاتی ہے۔“
 ”اب اس میں میرا کیا قصور، اگر تین بڑی عمر کے آدمی ایک چھوٹی سی بچی سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔“ فرزانہ بولی۔

”یہ تو واقعی آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔“ فرزانہ نے دور بین میں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا۔

”ادہ۔“

”کیا ہوا؟ یہ ادہ کہاں سے آٹپکا۔ دیکھو بھئی مجھے تمہاری ادہ سے بڑا ڈر لگتا ہے۔
 خدا کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے احتیاط برتنا کرو۔“ محمود نے گھبرائی ہوئی آواز

ہو جائے، بلکہ اچھے کودے۔“
 ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم تین دن سے یہاں آئے ہوئے ہیں، لیکن ان تین دنوں میں صرف دو مرتبہ سیر کرنے کے لئے گئے ہیں۔ ابھی تک ہم نے اعظم گڑھ کا بازار بھی نہیں دیکھے۔“
 ”دور بین جو موجود ہے۔ اس کے ذریعے یہاں بیٹھے بیٹھے ہی سیر ہو جاتی ہے۔“

فرزانہ بولی۔
 ”لیکن اس کی ٹانگیں تو حرکت میں نہیں آتیں اور پھر یہاں سے ہم دور بین کے ذریعے ساری آبادی تو نہیں دیکھ سکتے۔“

”گو یا تم یہ چاہتے ہو، ہم کوٹھی سے باہر نکلیں۔“ محمود نے کہا۔
 ”شکر ہے، خدا کا۔۔۔ کہ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو، ویسے میرا خیال تھا کہ اعظم گڑھ آکر تمہاری عقل گھاس چرنے لگی ہے اور اب تم جب تک یہاں رہو گے، عقل کی بات نہیں کر سکو گے۔“ فاروق نے جل کر کہا۔ ”لیکن آخر کار یہ بات ثابت ہو گئی کہ ابھی تمہاری عقل نے گھاس چرنا شروع نہیں کیا۔“

”عقل کی باتیں کرنے کے لئے فرزانہ جو موجود ہے۔“ محمود مسکرایا۔
 ”تم بھی کم تو نہیں ہو۔ ہمیشہ دو ہاتھ آگے ہی رہتے ہو۔“ فاروق نے فوراً کہا۔
 ”شکر کرو۔ صرف دو ہاتھ ہی آگے رہتا ہے، ورنہ اس کا بس چلے تو چار ہاتھ چھ ہاتھ آگے رہے۔“ فرزانہ تڑ سے بولی۔

”چھ ہاتھ۔ مگر میرے تو صرف دو ہاتھ ہیں۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔
 ”تمہارا کیا ہے، آگے رہنے کے لئے کسی سے چار ہاتھ ادھار بھی لے سکتے ہو۔“
 فاروق نے مسکرا کر کہا۔

”پھر تو میں تم سے ہی ہاتھ ادھار لوں گا۔“ محمود نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اچانک چونک اٹھی:

”لو وہ لڑکی تو ان سے بھی تیز نکلی۔ جونہی وہ اس کے نزدیک پہنچے وہ اٹھ کر بھاگ کھڑی ہوئی ہے۔“

”بہت خوب، یہ ہوئی نابات۔“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

”میرا خیال ہے، یہاں بیٹھ کر دور بین سے دیکھنے اور باتیں بنانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم اس کی مدد کو پہنچ جائیں۔ کہیں وہ انکے ہتے نہ چڑھ جائے۔“ فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

”یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ تجویز پیش کرنے میں تمہارا جواب نہیں؛ بہر حال اس وقت تمہاری بات بالکل معقول ہے اور میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔“ فاروق نے کہا۔

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس لڑکی کی مدد کرنا نہ چاہوں گا۔“ محمود نے تیز لہجے میں کہا۔

”گرم کیوں ہوتے ہو بھائی۔ تم بھی چلے چلو۔“ فاروق نے معصومانہ انداز میں کہا۔

فرزانہ کی ہنسی نکل گئی۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں خود چل کر لڑکی کی مدد کرنی چاہیے۔ دور بین ابھی تک فرزانہ کی آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔

”ارے۔ وہ جھاڑیوں میں چھپ گئی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ وہ بھی جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب وہ اسے ضرور گھیر لیں گے۔۔۔ چلو جلدی کرو۔“
تینوں گھبراہٹ کے عالم میں کوشی سے نکل کر بھاگ گئے۔

میں کہا۔

”اوہ، میں نے اس لئے کہا کہ وہ لڑکی بھاگتے بھاگتے گر پڑی ہے۔“ فرزانہ نے

پریشان ہو کر کہا۔

”ذرا میں بھی دیکھوں۔“ محمود نے کہا اور فرزانہ کے ہاتھ سے دور بین لے لی اور

پھر کہنے لگا:

”لڑکی نے اٹھنے کی کوشش کی ہے، دو قدم چلی ہے اور پھر گر گئی ہے۔۔۔ اوہ۔۔۔ فاروق۔۔۔ یہ آنکھ پھولی نہیں ہے۔ یہ تو کوئی اور ہی کھیل ہے۔“
یہ کہتے وقت محمود چونک اٹھا۔

”اور کون سا کھیل ہے؟ کبڈی، کرکٹ یا فٹبال؟“ فاروق نے مذاق اڑانے

والے لہجے میں کہا۔

”مذاق نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں فرزانہ، شاید تم نے ان تینوں کے چہروں کو غور سے نہیں دیکھا اور نہ لڑکی کے چہرے کو۔ لڑکی بہت خوفزدہ ہے اور ان تینوں کے چہروں پر ایک ظالمانہ مسکراہٹ۔“ محمود نے پریشان لہجے میں کہا۔

”کیا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس لڑکی کے دشمن ہیں اور

اسے پکڑنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں، نظر تو یہی آتا ہے۔“ محمود بولا۔

”ذرا میں بھی دیکھوں۔“

فاروق نے کہا اور دور بین محمود سے لے کر دیکھنے لگا۔ پھر یہ کہتے ہوئے دور بین

فرزانہ کو تھما دی۔

”محمود کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ یہ تو کوئی چکر معلوم ہوتا ہے۔“

”ہوں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ فرزانہ سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولی پھر

”وہ یہاں سے افراتفری کے عالم میں گئے ہیں۔“ انسپٹر جمشید بولے۔

”یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ؟“ بیگم جمشید نے پوچھا۔

”دور بین کرسی پر پڑی ہے لیکن اس کا تسمہ لٹک رہا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کرسی پر محمود کا رومال پڑا ہے۔ اگر وہ اطمینان کے عالم میں یہاں سے کہیں گئے ہوتے تو دور بین اور رومال کو اس طرح چھوڑ کر نہ گئے ہوتے اور تمہیں بھی بتا کر جاتے۔“

”ہوں، بات ٹھیک ہے، پھر اب کیا کیا جائے۔“ بیگم جمشید نے فکر مند ہو کر کہا۔

”یہی سوچ رہا ہوں۔“ انسپٹر جمشید بولے اور پھر برآمدے کی دیوار سے نیچے جھانکنے لگے پھر کچھ سوچ کر انہوں نے دور بین اٹھا کر آنکھوں سے لگائی اور اس کے ذریعے ارد گرد دور دور تک دیکھنے لگے۔ اچانک وہ چونک اٹھے:

”اوہ، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔“ ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

”کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔“ بیگم جمشید جلدی سے بولیں۔

”مجھے ایک لڑکی نظر آ رہی ہے۔ تین آدمی اسے پکڑے ہوئے ہیں۔ نہ جانے وہ

اس لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی بُری طرح سہمی ہوئی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ کہیں وہ تینوں یہی منظر دیکھ کر تو اس طرف نہیں گئے ہیں۔“

”تھوڑی دیر پہلے تو یہ منظر نہیں رہا ہوگا۔“ انسپٹر جمشید سوچ میں ڈوبتے ہوئے

بولے۔

”خیر۔۔۔ انہوں نے جو کچھ بھی دیکھا ہو، آپ کھڑے کیا سوچ رہے ہیں، اس

لڑکی لئے کچھ کریں خدا جانے وہ کون لوگ ہیں اور اس لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرنا

چاہتے ہیں۔“

”یہی تو سوچ رہا ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، وہ اس لڑکی کو جان سے مارنا

چاہتے ہیں۔“

صرف ایک انگوٹھی

انسپٹر جمشید نہا کر باہر نکلے۔ ان کی نظر برآمدے پر پڑی۔ وہاں محمود، فاروق اور فرزانہ نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا، باورچی خانے میں اپنی امی کو ستارہ ہے ہوں گے وہ باورچی خانے کے دروازے پر آئے تو اندر صرف بیگم جمشید کھانا تیار کر رہی تھیں۔

”یہ۔۔۔۔۔ بچے کہاں چلے گئے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ابھی برآمدے میں ہی تو بیٹھے تھے۔“ بیگم جمشید بولیں۔

”لیکن اب وہاں نہیں ہیں۔“

”تو۔۔۔۔۔ بچے چلے گئے ہوں گے۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ خیر میں انہیں آواز دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو آوازیں دیں، لیکن ان کی طرف سے

کوئی جواب نہیں ملا۔ اب تو وہ کچھ فکر مند ہو گئے۔

”وہ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔ خدا خیر کرے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ یہ سن کر بیگم جمشید

بھی گھبرا گئیں۔

وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے میں آئے۔ بیگم جمشید بھی ان کے پیچھے

چلی آئی تھیں۔ انسپٹر جمشید نے برآمدے کا جائزہ لیا۔ ایک کرسی پر انہیں دور بین پڑا

نظر آئی۔ دوسری کرسی پر ایک رومال پڑا تھا۔

”آپ کا یہ خیال ہے اور آپ پھر بھی یہاں کھڑے ہیں۔“ بیگم جمشید گھبرا کر بولیں۔

”ہاں، کیونکہ میں جانتا ہوں۔۔۔ محمود، فاروق اور فرزانہ ان تک پہنچنے ہی والے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔

”کیا وہ آپ کو نظر آ گئے ہیں۔“ بیگم جمشید نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”نہیں، درمیان میں کچھ پہاڑیاں ہیں۔ اس لئے جب وہ ان کے پاس پہنچیں گے، اس وقت ہی نظر آ سکیں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے جواب دیا۔

”اور اگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے لڑکی کو جان سے مار دیا ہے۔“ بیگم جمشید نے سوال کیا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید تیزی سے مڑے اور ایک الماری کھول کر اس میں سے اپنی رائفل نکال لی۔ انہوں نے دائیں ہاتھ سے رائفل کندھے سے لگائی اور دُور بین میں دیکھتے ہوئے بولے:

”یہ رائفل اتنے فاصلے پر مار کر سکتی ہے۔ میں یہیں کھڑے کھڑے ان سے منہ نہ کر سکتا ہوں۔“

”اور اگر گولی لڑکی کے لگ گئی تو؟“ بیگم جمشید نے گھبرا کر کہا۔

”میرا نشانہ اتنا کمزور نہیں ہے، اور پھر گولی چلانے کی تو شاید نوبت ہی نہیں آئے۔“

”یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید نے دُور بین بیگم کو پکڑا دی اور بولے:

”دُور بین میری آنکھوں سے تم لگاؤ گی؛ کیونکہ رائفل ایک ہاتھ سے نہیں چلائی جاسکتی۔“

دُور بین میں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے رائفل کی ٹال سیدھی کر لی اور نشانہ

لیتے ہوئے بولے:

”تینوں آدمی لڑکی کے ایک ہاتھ پر جھکے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے جان سے نہیں مارنا چاہتے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟“ انہوں نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔

”کیا آپ کو لڑکی کا ہاتھ نظر آ رہا ہے۔“ بیگم جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں، اس کی انگلیاں تک نظر آ رہی ہیں۔۔۔ ارے، یہ تو اس لڑکی کی انگلی سے انگوٹھی اتار رہے ہیں۔ انگوٹھی جو شاید سونے کی ہے۔“ انہوں نے چونک کر کہا۔

”اوہ، یہ تو لوگ چور یا ڈاکو ہیں۔“ بیگم جمشید کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا۔

”ہاں، کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ انگوٹھی شاید تنگ ہے، وہ نکل نہیں رہی ہے۔ تینوں باری باری کوشش کر رہے ہیں۔ لڑکی بھی ہاتھ چر مارنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ بدمعاشی طرح جکڑی ہوئی ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

”پھر اب آپ کیا کریں گے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جب تک یہ لوگ کوئی خطرناک قدم نہیں اٹھاتے، میں ان پر فائر نہیں کر سکتا۔“

”آخر یہ محمود، فاروق اور فرزانہ کہاں رہ گئے؟“ بیگم جمشید نے غصے میں آ کر کہا۔

”فاصلہ بہت ہے، پہنچتے پہنچتے ہی پہنچیں گے اور پھر پہاڑی راستے تو اور بھی دشوار گزار ہوتے ہیں۔ ارے۔۔۔ یہ لو۔“ انسپکٹر جمشید بدمعاشی طرح چونکے۔

”کیا ہوا.....؟“ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

”ان لوگوں نے انگوٹھی نکال لی۔ ارے ہائیں۔ یہ کیا ہوا۔ ان میں سے ایک

گر پڑا ہے۔ اسے کیا ہوا۔ اب مجھے ہی جانا پڑے گا۔“

انسپکٹر جمشید نے کہا اور رائفل بیگم جمشید کو دیتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

انہوں نے لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ نئی طرح کا تپ رہی تھی۔ یہ حال دیکھ کر انہوں نے اس پر کچھ ترس آ گیا۔ اس نے لڑکی سے کہا:

”گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم تو تمہاری انگلی سے صرف یہ پتہ چل رہا ہے۔“

”انگوٹھی۔ مم۔ مگر کیوں؟ تم یہ انگوٹھی کیوں چھیننا چاہتے ہو۔ کیا تم چور ہو؟“
 ”نہیں لڑکی ہم چور نہیں ہیں۔“ شریف نے تیز لہجے میں کہا اور لڑکی کی انگلی پر
 انگوٹھی کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔

”چور نہیں ہو تو پھر یہ انگوٹھی کیوں اتار رہے ہو؟“ لڑکی نے حوصلہ کر پوچھا۔
 ”اس لئے اس انگوٹھی کے ہمیں پچیس ہزار روپے ملیں گے۔“

”بچیس ہزار روپے اور اس معمولی سی انگوٹھی کے۔“ لڑکی نے حیران ہو کر کہا۔
 ”ہاں، کسی کو اس کی ضرورت ہے۔“ انور نے مسکرا کر کہا۔

”یہ انگلی تو بہت تنگ ہے۔ کسی طرح اتاری نہیں رہی ہے۔“ شریف نے ڈاکر کہا۔

”تم ہٹ جاؤ، میں اتارتا ہوں۔“ رشید نے کہا اور لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور گھر
 نکالنے کے لئے زور لگانے لگا، لیکن اُسے بھی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر انور نے زور آزمایہ
 شروع کی۔ انگوٹھی بہت جگ تھی۔ انور نے زور جو لگایا، تو تکلیف کی وجہ سے لڑکی
 منہ سے چیخ نکال گئی۔

پھر ایک ساتھ دو باتیں ہوئیں۔ ایک طرف تو انور کے ہاتھ میں انگلی آئی
 دوسری طرف شریف کے سر پر ایک پتھر زور سے لگا۔ اس کے منہ سے ایک جھجکا
 اور وہ دھڑام سے نیچے آ رہا۔ انور اور رشید نے گہرا کر کہا ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑے

قاصد پر انہیں دو لڑکے اور ایک لڑکی کھڑے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ابھی اور بھی پتھر تھے۔

”سنو۔ ابھی ہم نے صرف ایک پتھر چلایا ہے۔ تم دونوں بھی پتھروں کی زد میں ہو۔ لیکن پتھر کھانے سے پہلے یہ بتا دو کہ یہ چکر کیا ہے۔ آخر یہ کیسی انگوٹھی ہے۔۔۔ جس کے جسم میں کوئی پکیس ہزار روپے دے گا۔ وہ کون ہے؟“ فاروق نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

”یہ ہمیں معلوم نہیں اور اگر معلوم بھی ہو تو ہم تمہیں کیوں بتانے لگے۔“ انور نے
 غصلا کر کہا۔ اتنی دیر میں شریف سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
 ”اگر تم نہیں بتاؤ گے تو تین پتھر اور تمہاری طرف سیر کرتے ہوئے آئیں گے۔
 اگر وہ تمہارے سروں کا مزاج پوچھتے ہوئے گزریں تو بڈا نہ ماننا۔“ فرزانہ بولی اور
 تینوں نے پتھروں والے ہاتھ اوپر اٹھائے۔
 ”بھاگو۔“ شریف چلا یا۔

یہ لفظ کچھ اس قدر زور سے کہا گیا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی گڑبڑا گئے اور ان کے نشانے چمک گئے۔ شکر ہوا کہ پتھر لڑکی کے نہیں لگے؛ بہر حال تینوں بدمعاش خجروں کے دار سے صاف بچ گئے تھے اور اب وہ بے تماشاً بھاگے جا رہے تھے۔

”کیا ہم ان کا پیچھا کریں؟“ فاروق نے پوچھا۔

”کوئی قائمہ نہیں۔ ہم تینوں ان سے انگوٹھی نہیں چھین سکیں کیا اور پھر ایک انگوٹھی کی بات ہی کیا ہے کہ جان کو خطرے میں ڈالا جائے۔“ محمود نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

”اب وہ لڑکی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ محمود نے ایک قدم آگے بڑھا کر کہا:
”گھبراؤ نہیں، ہم تمہارے دوست ہیں۔ بد معاش بھاگ چکے ہیں۔ شکر ہے کہ

تھے۔

”تو پھر چلو، دیر نہ کرو۔“ فرزانہ نے پیار بھرے انداز میں اُسے بازو سے تھامتے ہوئے کہا۔

”اچھا.....“ لڑکی کے منہ سے نکلا۔

”بھئی، یہ تم یہاں کھڑے کھڑے کیا باتیں کر رہے ہو؟“ اچانک انسپکٹر جمشید کی آواز آئی۔

”وہ چونک کر مڑے۔ انسپکٹر جمشید تھوڑے فاصلے پر کھڑے مکرار ہے تھے۔

☆☆☆

”تمہاری جان بچ گئی۔“

”وہ مجھے ان جان سے نہیں مارتا چاہتے تھے، صرف انگٹھی اتارنا چاہتے تھے اور انگٹھی وہ لے گئے۔“

”تو کیا ہوا۔ وہ صرف ایک انگٹھی ہی تو تھی۔“ فرزانہ نے اُسے تسلی دی۔

”لیکن وہ مجھے میرے ابو نے مرتے وقت دی تھی اور اسے حفاظت سے رکھنے کے لئے آخری دم تک کہتے رہے تھے۔“ لڑکی نے بتایا۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”تو کیا وہ کوئی خاص انگٹھی تھی۔“ آخر فرزانہ نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں، تھی تو عام سی سونے کی انگٹھی۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ تینوں بد معاش پکڑے جائیں اور ان سے تمہاری انگٹھی لے لی جائے۔“ فاروق نے کہا۔

”تم لوگ کون ہو اور تم کیسے کوشش کرو گے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”سوالات تو ہم بھی کئی کرنا چاہتے ہیں، کیوں نہ تم ہماری کوٹھی تک چلو۔ وہاں ہمارے بٹا جان بھی ہوں گے۔ وہ خفیہ پولیس کے انسپکٹر ہیں۔ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔“ فاروق نے نرم اور میٹھے لہجے میں تجویز پیش کی۔ لڑکی سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بولی:

”لیکن مجھے اپنے گھر بھی تو پہنچنا ہے۔ میرے چچا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں انگٹھی کے بارے میں بھی بتانا ہے۔“

”ہم تمہیں پہنچا دیں گے اور جب ساری بات انہیں بتائیں گے تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے، ویسے کیا تم لوگ یہیں رہتے ہو؟“ محمود نے کہا۔

”نہیں، ہم شہر میں رہتے ہیں۔ یہاں تو موسم گرما کی چھٹیاں گزارنے آئے

”تم نے انگوٹھی سنبھال کر رکھ لی ہے نا۔“ انور نے پوچھا۔
 ”ہاں، میرے کوٹ کی جیب میں ہے۔ فکر نہ کرو۔“ شریف بولا۔
 ”دیکھ کر کہیں گرا نہ دینا۔ ان پہاڑیوں میں اگر وہ گر گئی تو پھر نہیں ملے گی۔“
 ”کوٹ کی جیب میں سے بھلا وہ کیسے گر سکتی ہے۔“ شریف نے منہ بنا کر کہا۔
 ”کیوں نہ ہم اس انگوٹھی کا راز معلوم کرنے کی کوشش کریں۔“ انور کو نیا خیال
 سوچھا۔

اب انہوں نے دوڑنا بند کر دیا تھا؛ البتہ قدم تیز تیز اٹھا رہے تھے۔ انور کی بات
 سن کر شریف چونک اٹھا۔ چند لمحوں تک سوچتا رہا، پھر بولا۔
 ”کیا مطلب۔ بھلا ہم اس راز کو کیسے معلوم کر سکتے ہیں اور پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو
 کہ اس انگوٹھی کا کوئی راز بھی ہے۔ نہ ہم اس لڑکی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں، نہ
 اس شخص کے بارے میں جو انگوٹھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دو دن پہلے وہ ہمیں ہوٹل میں
 ملا تھا اور اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اس نے ہمارے بارے میں پہلے ہی معلومات
 حاصل کر لی ہوں گی کہ ہم اس قسم کے کام کرتے ہیں۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے
 لڑکی کی تصویر دکھائی، پتا بتایا اور کہا کہ اگر ہم اس لڑکی کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پتلی
 ہوئی انگوٹھی اسے لا کر دے دیں تو وہ ہمیں پچیس ہزار روپے دے گا۔“
 ”اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ضرور اس انگوٹھی میں کوئی راز ہے؛ ورنہ اس کی قیمت
 تو زیادہ سے زیادہ دو سو روپے ہو سکتی ہے۔ کہاں دو سو اور کہاں پچیس ہزار۔“
 ”اگر تمہاری بات مان بھی لی جائے تو ہم اس انگوٹھی کے بارے میں کیسے معلوم
 کر سکتے ہیں۔“ رشید نے پوچھا۔ ”اور پھر ہمیں اس جھیلے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا
 ہے۔“
 ”اس شخص کی نگرانی کر کے جو انگوٹھی کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس مکان کی نگرانی

ارے!

رشید، انور اور شریف بھاگتے ہوئے دور نکل آئے تھے۔ دو ایک بار انہوں نے
 پیچھے مڑ کر بھی دیکھا۔ انہیں چاروں بچے ایک جگہ کھڑے نظر آئے۔ وہ ان کے پیچھے
 نہیں آئے تھے۔
 ”ہم انگوٹھی حاصل کر چکے ہیں، اس لئے ہمیں جلد از جلد ہوٹل پہنچ جانا چاہئے۔“
 رشید بولا۔
 ”آخر یہ تین بچے کون تھے۔ یہ کہاں سے نکل آئے۔ کم بختوں نے ایسا پتلا
 کہ سر پھٹ گیا ہے۔“ شریف نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔
 ”خدا جانے کون تھے۔ یہ کہاں سے نکل آئے۔ اتنا ضرور ہے کہ اگر ہم کچھ دیر
 وہاں ٹہرتے تو تینوں کے سر سلامت نہ رہتے۔ کم بخت بہت پھر تیلے تھے اور نشانہ
 پنتہ تھا۔“
 ”کچھ بھی ہو، اب ہمارے پچیس ہزار کہیں نہیں گئے۔“ انور بولا۔
 ”آخر یہ حضرت کون ہیں جو انگوٹھی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس انگوٹھی
 ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ اس کے بدلے پچیس ہزار روپے
 دینے کو تیار ہیں۔“ رشید بولا۔
 ”ہو سکتا ہے، یہ کوئی خاص قسم کی انگوٹھی ہو۔“ شریف نے خیال ظاہر کیا۔

سجیدگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا افسر ہو۔ تینوں نے اس کے پاس سے نکل جانا چاہا لیکن وہ اچانک ان کے سامنے آگیا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

”ذرا سنیے۔“ یہ کہتے وقت اس نے شریف کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بھی بڑھا دیا اور اس سے کچھ نزدیک ہو گیا۔ تینوں کچھ گھبرا س گئے۔

”جی فرمائیے۔“ شریف بولا۔

”معاف کیجئے گا۔ کیا یہاں آس پاس کوئی کرائے کا مکان مل سکتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی کچھ کہا نہیں جاسکتا، کسی اور سے معلوم کریں۔“ شریف نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

”اچھا، مجھے افسوس ہے۔ میں نے آپ کا راستہ بونہی روکا۔“ اس آدمی نے بااخلاق لہجے میں کہا۔

”جی کوئی بات نہیں۔“ شریف نے بھی مسکرا کر کہا۔

وہ آدمی ان کے پاس سے گزرتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا۔ ان لوگوں نے اپنا راستہ لیا۔ جب وہ ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو وہ شخص اپنے کمرے میں اُن کا انتظار کر رہا تھا جس نے انہیں انگٹھی لانے کے لئے کہا تھا۔ اس کے سر پر ایک بڑے عجیب والے ہیٹ تھا اور آنکھوں پر بڑے بڑے شیشوں والی عینک تھی۔

”کہو۔ کیسا رہا؟“ ان پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔ تینوں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ہیٹ اور عینک کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

”جناب، ہم انگٹھی لے آئے ہیں۔“ شریف نے کہا۔

”بہت خوب، لاؤ وہ مجھے دے دو۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بے تابی سے کہا۔

کر کے جس میں بچی رہتی ہے ہم اس انگٹھی کے راز کو جان سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے طرح ہمیں کوئی لمبی رقم مل جائے۔“

”بات تو معقول ہے۔ تو گویا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم انگٹھی اس کے ہاتھ کریں۔“ شریف نے پوچھا۔

”نہیں، میں نہیں کہتا۔ ہمیں انگٹھی اسے دے کر پچیس ہزار روپے وصول کر چاہیے۔ اس کے بعد ہم یہ کوشش کریں گے۔“ انور نے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ شریف بولا۔

”تو بس پھر یہ طے رہا۔ میں اور شریف اس آدمی کی نگرانی کریں گے اور ان کے مکان کی نگرانی کرنا۔“ انور نے شریف سے کہا۔

”مجھے منظور ہے، اور اس طرح اگر ہمیں اس انگٹھی کا راز معلوم ہو گیا اور کوئی رقم ہاتھ آگئی تو اسے ہم آپس میں تقسیم کر لیں گے۔“ شریف نے جیسے فیصلہ کر دیا۔

”بالکل ٹھیک۔ واقعی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس انگٹھی میں کسی خزانے کا راز انور نے کہا۔

”انگٹھی میں خزانے کا راز۔ یہ کیا بکواس ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ہنسا۔

”اب یہ تو راز کے معلوم ہونے کے بعد ہی پتا چلے گا۔“ انور بولا۔

”ارے۔ ادھر دیکھو۔ دوسری طرف سے ایک آدمی آ رہا ہے۔ اس نے کترا کر نکل جانا۔“ شریف نے چونک کر کہا۔

”کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے؟“ انور نے کہا۔

”احتیاط اچھی ہوتی ہے۔“ شریف نے کہا۔

سامنے سے آنے والے آدمی کے جسم پر سرمئی رنگ کا سوٹ تھا۔ چہرے پر

میں مسکرائے۔

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ محمود نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”تم یہاں تک کیسے پہنچ گئے۔“ انسپکٹر جمشید نے اٹان سے سوال کیا۔

”جی..... ہم..... ہم دور بین سے ارد گرد کا نظارہ کر رہے تھے کہ وہ تینوں اس

بیچاری کا پیچھا کرتے نظر آئے اور ہم اس کی مدد کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن

آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔“

”میں نہا کر نکلا تو تم تینوں برآمدے میں نہیں تھے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

تمہاری اتنی سے پوچھا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ پھر میری نظر دور بین پر پڑی۔ وہ اگرچہ

کرسی پر رکھی تھی لیکن اس کا تسمہ لٹک رہا تھا۔ اگر تم اطمینان کی حالت میں وہاں سے

آئے ہوتے تو اس کا تسمہ اس طرح لٹک نہ رہا ہوتا اور پھر محمود کا رومال بھی ایک کرسی پر

پڑا تھا۔ میں نے فوراً ہی دور بین سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہ تینوں اور یہ لڑکی مجھے نظر

آ گئے، میں بھی اس کی مدد کے لئے بھاگ کھڑا ہوا۔“

”لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ وہ انگوشی لے گئے ہیں۔“

”میں نے دور بین سے سب کچھ دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک کے ہتھیار لگتے

بھی دیکھا ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”پھر اب کیا پروگرام ہے۔ ویسے ہمیں افسوس ہے کہ وہ انگوشی لے جانے میں

کامیاب ہو گئے۔ ہمیں چند سیکنڈ کی دیر ہو گئی۔“ محمود نے مسکری صورت بنا کر کہا۔

”جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب چلو گھر چلیں۔ وہاں اس بچی کی کہانی سنیں گے اور پھر

اس سے اس کے گھر چھوڑ آئیں گے۔“ انہوں نے کہا۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ فاروق بولا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ اسی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ بیگم جمشید بھی وہیں آ گئی تھیں۔

”جی ہاں، کیوں نہیں، ہم وہ آپ ہی کے لئے لائے ہیں، لیکن اس سے پہلے

انگوٹھی ہم آپ کے حوالے کریں، آپ کو پچیس ہزار روپے ہمیں ادا کرنے ہوں گے۔

انور نے کہا۔

”بالکل ٹھیک۔ یہ رہے تمہارے پچیس ہزار۔“ اس نے اپنے بیک میں سے

روپے والے نوٹوں کی گڈیاں ان کے سامنے میز پر پھینک دیں۔

”یہ ہوئی بات۔“ انور نے خوش ہو کر کہا۔ پھر گڈی اٹھاتے ہوئے بولا:

”شریف، انگوشی انہیں دے دو۔“

شریف نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، لیکن اس کا ہاتھ باہر نہ نکلا۔ اندر سے

گیا۔ اس کا منہ فٹ ہو گیا۔ یوں لگا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔

”کیا بات ہے۔ کیا تمہارے ہاتھ کو کسی چیز نے پکڑ لیا ہے۔“ اس آدمی نے

جین ہو کر کہا۔ انور اور رشید نے بھی شریف کو بری طرح گھورا۔

”وہ۔ وہ۔ انگوشی۔“ شریف ہکلا یا۔

”انگوٹھی۔ کیا ہوا انگوشی کو؟“

”وہ میری جیب میں نہیں ہے۔“ اسکے منہ سے اس طرح نکلا جیسے وہ کسی گہرے

کنوئیں میں سے بولا ہو۔

”کیا؟“ ان تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆☆

”ابا جان، یہ بے چاری۔۔۔“ فاروق نے اس لڑکی کے بارے میں انسپکٹر جمشید

کو بتانا چاہا مگر انہوں نے بات کاٹ دی۔

”میں جانتا ہوں، تم بد معاش اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور وہ اس کی انگلی

سے انگوشی نکال کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“ وہ یہ کہتے وقت دلکش انداز

انہیں بھی اس لڑکی سے بہت ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ چائے پینے کے بعد انہیں جھید نے پوچھا:

”ہاں بیٹی اب بتاؤ۔ یہ کون لوگ تھے اور تمہاری انگٹھی کیوں لے گئے ہیں؟“ ب سارا کاروبار انہی کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔“ لڑکی بولی۔

”میں نہیں جانتی۔ نہ جانے کون تھے۔ شاید چور تھے۔ انہوں نے میرے انگٹھے لے لیے۔“

”میں سونے کی انگٹھی دیکھ لی ہوگی۔“

”کیا وہ کوئی خاص قسم کی انگٹھی تھی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں۔ بس سونے کی انگٹھی تھی۔ مرتے وقت میرے والد نے دی تھی۔“

”تم کون سی جماعت میں پڑھتی ہو؟“

”جی آٹھویں میں۔“

”کیا اس انگٹھی کا کوئی راز بھی ہے؟“

”جی نہیں، کم از کم مجھے تو والد نے کچھ نہیں بتایا؛ البتہ اس کی حفاظت کرنے کے لیے بار بار کہتے رہے تھے۔“

”ابا جان، ہم نے ان کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔“ فاروق کو اچانک خیال آیا۔

”میرا نام خالدہ ہے۔“ وہ بولی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے کسی بھائی یا بہن کے ساتھ رہتی ہو۔“

”جی نہیں، میرا اس دنیا میں کوئی بھائی ہے نہ بہن۔ بس ایک چچا ہیں اور انہی کے ساتھ شہر میں رہتی ہوں۔ یہاں چچا جان اس موسم میں کچھ دن گزارنے آتے ہیں والدہ کی انگلی سے انگٹھی اتار لی تو ان میں سے ایک نے خوش ہو کر کہا تھا، اب ہمارے اس مرتبہ مجھے بھی ساتھ لے آئے۔“ اس نے تفصیل سے ساری بات بتائی۔

”تو اس سے پہلے وہ کبھی تمہیں نہیں لائے تھے؟“ محمود نے سوال کیا۔

”جی نہیں، اس سے پہلے تو میں اپنے والد کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ وہ ابھی چند جھید نے کہا۔ ان کی آنکھیں یہ سن کر کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں۔“

”ایسی تو اس میں کوئی بات نہیں تھی۔“ خالدہ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”تو پھر یہ بات ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص اس انگٹھی کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس نے“

”تمہارے والد کیا کام کرتے تھے؟“ انہیں جھید نے پوچھا۔

”وہ ایک بہت بڑے تاجر تھے۔ چچا جان بھی ان کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔“

”پے دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔“ فرزانہ بولی۔

”ہوں، ضرور یہی بات ہے۔ خیر، میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کب
چکر ہے۔ آؤ بھی تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔“ انسپکٹر جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا
”تاجان، ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔“ فرزانہ بول اٹھی۔
”اچھی بات ہے۔ چلے چلو۔“ انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

ابھی وہ اٹھتے ہی تھے کہ انہوں نے کسی خیال کے تحت دُور بین اٹھا کر اس
میں دیکھا، جہاں تھوڑی دیر پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ پھر ان کے چہرے پر
پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا بات ہے تاجان، آپ مسکرا کیوں رہے ہیں؟“ محمود نے حیران ہو کر کہا
”لو، تم بھی دیکھ لو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دُور بین محمود کو دے دی پھر جوئی
نے اسے آنکھوں سے لگایا، اس کے منہ سے نکلا۔
”ارے۔“

اس کے منہ سے ’ارے‘ کا نکلتا تھا کہ فاروق نے بھی دُور بین اس کے ہاتھ
جھپٹ لی۔ پھر اس کے منہ سے بھی ارے نکلا اور دُور بین فرزانہ کی آنکھوں سے
اور جب بیگم جمشید نے اسے بھی ارے کہتے سنا تو ان سے رہا نہ گیا۔ بول اٹھیں:
”کیا تم تینوں پر ارے کا دورہ پڑ گیا ہے۔“

”ان کا قصور نہیں۔ پہاڑیوں میں اس وقت وہ تینوں بدمعاش موجود ہیں، جن
نے تھوڑی دیر پہلے انگوٹھی اڑائی تھی۔“ انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

”ارے۔“ بیگم جمشید کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور ان کی ہنسی نکل گئی۔
”میں ابھی آتا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا اور کوٹھی سے نکل کر ان کی طرف
گئے۔

دوسری ملاقات اور جھڑپ

وہ دھک سے رہ گئے۔ چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ آخر انور نے تیز لہجے میں کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ انگوٹھی تو تم نے کوٹ کی جیب میں رکھی تھی۔“

”ہاں، لیکن وہ اس میں نہیں ہے۔“ شریف کے منہ سے نکلا۔

”یہ کیا بکواس ہے، تم لوگ مجھے دھوکا دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے۔“ بیٹ
والے نے کہا۔

”نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ انگوٹھی ہم نے حاصل کر لی تھی۔ لیکن
شاید وہ کہیں گر گئی ہے۔“ رشید بولا۔

”خدا کے بندے تمام جیبوں کو اچھی طرح دیکھو۔“ انور نے گھبرا کر کہا۔

شریف نے جلدی جلدی تمام جیبوں کی تلاشی لے ڈالی لیکن انگوٹھی کہیں نہ ملی۔ وہ
سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر بیٹوالے نے کہا:

”میں سمجھ گیا، تم مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”نہیں جناب، ہم بے ایمان نہیں ہیں، میرا خیال ہے، انگوٹھی اس وقت گری،
جب وہ آدمی ہم سے ٹکرایا تھا۔“

”کون سا آدمی؟“ انور نے پوچھا۔

”وہی جس نے کرائے کے مکان کے بارے میں پوچھا تھا۔“ شریف نے فکر

مند ہو کر کہا۔
”اوہ، تو کیا کوئی آدمی تم سے ٹکرا گیا تھا؟“ ہیٹ والے نے چونک کر کہا۔
”جی نہیں۔ لیکن اس نے مجھ سے ہاتھ ضرور ملایا تھا اور کسی کرائے کے مکان کے

لئے پوچھا تھا۔“
”تو پھر یہ عین ممکن ہے کہ انگوٹھی وہاں گر گئی ہو۔“ ہیٹ والا بولا۔
”ٹھیک ہے، ہم ابھی وہاں جا کر ڈھونڈتے ہیں۔“ رشید بولا۔
”ضرور ڈھونڈو، مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔“ ہیٹ والے نے جھنجھلا کر کہا۔
”تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی وقت ہیٹ والے نے کہا:
”میرے پچیس ہزار روپے مجھے دے جاؤ۔“

”لیکن ہم تمہارا کام کر چکے ہیں۔“ انہوں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔
”انگوٹھی مجھے کب ملی ہے۔ میں نے پچیس ہزار روپے انگوٹھی کے دینے کا وعدہ کیا تھا کہ تمہاری کامیابی کے ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کامیابی بھی کیسی۔۔۔۔۔ جب تم انگوٹھی یہاں تک لائے ہی نہیں۔“ ہیٹ والا تیز لہجے میں بولا۔
”ہم ابھی ڈھونڈ کر لادیتے ہیں۔“ شریف بولا۔

”ضرور لادو۔ جو نہی تم انگوٹھی لادو گے، میں پچیس ہزار کے بنڈل تمہیں دے دوں گا۔“

”اور اگر ہم بنڈل واپس نہ کریں۔ تو۔“ رشید نے تیز لہجے میں کہا۔
”کیا مطلب۔ کیا تم بغیر میرا کام انجام دیئے میرے روپے ہڑپ کرنا چاہتے ہو۔“

”ارادہ تو یہی ہے۔ ہم بد معاش ہیں اور تمہیں ہیں۔ تم شریف آدمی ہو۔ اور تمہارا خدا حافظ۔“ انور نے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔

”شہر و بھٹی، ایسے نہیں۔ اب میں اتنا شریف بھی نہیں بنتا تم سمجھتے ہو۔ اگر تم نے میری طرف مڑ کر نہ دیکھا تو تم تینوں کے جسموں میں ایک ایک گولی اتر جائے گی۔“ اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

تینوں چونک کر مڑے۔ ہیٹ والے کے ہاتھ میں پستول تھا اور چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ، جو انہیں بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ آخر وہ بولا:

”تم سے کام لینے سے پہلے میں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ تم تینوں اول درجے کے بے ایمان ہو۔ پیسے کے لئے ہر شخص کو دھوکا دے سکتے ہو۔ اسی لئے میں تمہارا انتظام کر کے ہی یہاں آیا تھا۔ اب کیا خیال ہے۔ تم نوٹوں کی گڈیاں واپس دینے کا ارادہ رکھتے ہو یا نہیں۔“

”جنتاب، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ یہ لہجے، یہ آپ کی گڈیاں۔“ یہ کہہ کر شریف نے نوٹوں کی گڈیاں اس کی طرف اچھال دیں مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی جس پر تینوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ دراصل انہوں نے چالاکی کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ ہیٹ والا نوٹوں کی گڈیاں اٹھانے کے لئے جھکے گا اور وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس پر نوٹ پڑیں گے مگر وہ ان سے بھی چالاک نکلا۔ اب نوٹوں کی گڈیاں اس کے پیروں کے پاس پڑی تھیں۔

”بہت خوب، اب تم جا سکتے ہو۔ اگر انگوٹھی تمہیں مل جائے تو کل اسی وقت یہاں لے آنا، میں یہ نوٹ تمہیں دے دوں گا۔“ اس نے طنز یہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

”ہم ابھی جا کر اسے تلاش کرتے ہیں۔“ انور نے جلدی سے کہا۔
”ٹھیک ہے۔“ ہیٹ والا مسکرایا اور تینوں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

ایک بار پھر ان کا رخ اس طرف ہو گیا جہاں انہوں نے انگوٹھی لڑکی کی انگلی سے

اتاری تھی۔

”یہ بیٹ والا تو ہم سے بھی چالاک ہے۔“ راستے میں انور نے کہا۔

”خود کو عقل مند سمجھنے والے بے وقوف ہوا کرتے ہیں۔“ رشید بولا۔

”میں بہت دیر سے ایک بات سوچ رہا ہوں۔“ شریف بولا۔

”تم تو بس بول رہے ہو۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ ہم پچیس ہزار کے مالک بن

جئے رہ گئے۔“ انور نے جل بھن کر کہا۔

”اسی سلسلے میں تو کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ شریف نے کہا۔

”خیر کہو۔ دیے ہمیں تم پر غصہ بہت آ رہا ہے۔“ رشید بولا۔

”میں سوچ رہا ہوں، کہیں انگوٹھی اسی آدمی نے تو میرے کوٹ کی جیب سے

نکالی جو ہم سے ملا تھا اور مکان کے لئے پوچھ رہا تھا۔“ شریف بولا۔

”بھلا اسے کس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ تمہاری جیب میں سونے کی انگوٹھی ہے۔

انور نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے، وہ کوئی جیب کترا ہو، اس کا کام ہی یہی ہو، لوگوں کی جیبیں سنا

کرنا۔“ رشید نے خیال ظاہر کیا۔

”پہلے ہم ان پہاڑیوں میں انگوٹھی کو تلاش کریں گے، اگر نہ ملی تو اس جیب کتر

کو تلاش کریں گے اور انگوٹھی اس سے خرید لیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے کسی سنا

ہاتھوں فروخت ہی کرے گا۔ جب ہم اسے اس انگوٹھی کے دو تین سو روپے دے

ارادہ ظاہر کریں گے تو وہ خوشی سے تیار ہو جائے گا۔“ انور بولا۔

”لیکن کیوں، اگر وہ ہمیں کہیں مل گیا تو ہم اس سے انگوٹھی زبردستی ہی ما

کر لیں گے۔“ رشید نے کہا۔

”ہو سکتا ہے، اس وقت تک وہ اسے کہیں اور رکھ چکا ہو۔“ شریف بولا۔

”خیر دیکھا جائے گا۔“ انور نے کندھے اچکائے۔ تینوں ہی بہت بے فکر ہو گئے

تھے۔

اب وہ اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں ان سے وہ آدمی ملا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں

نے ایک ایک انچ جگہ کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آدھ گھنٹہ گزر گیا لیکن

انگوٹھی کو نہ ملتا تھا نہ ملی۔ آخر وہ تھک کر چور ہو گئے اور دم لینے کے لئے سیدھے ہو کر

کھڑے ہو گئے۔ سیدھا ہوتے ہی ان کی نظر ایک آدمی پر پڑی۔

وہ ان کے نزدیک ہی کھڑا تھا اور انہیں مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

”ارے، یہ تو وہی ہے جو ہم سے مکان کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ شریف

کے منہ سے نکلا۔

”ہاں، میں وہی ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ مجھے مکان مل گیا ہے۔“ اس

نے مسکرا کر کہا۔

”مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ انور نے جھٹکا کر پوچھا۔

”تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”سنو، کیا تم جیب کتر رہے ہو؟“ رشید نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”کیا کہا۔ جیب کترا۔ خبردار، میں اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے

غصے میں آ کر کہا۔

”زبان نہ چلاؤ۔ تم نے میری جیب سے سونے کی انگوٹھی نکالی ہے۔“ شریف نے

بھی غصا کر کہا۔

”اچھا، تمہیں کس نے بتایا۔“ اس نے حیران ہو کر کہا۔

”دیکھو۔ سیدھی طرح وہ انگوٹھی دے دو۔ ورنہ۔“ شریف نے اسے دھمکی دی۔

”ورنہ تم کیا کرو گے۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

”ہم انگوٹھی تم سے حاصل کر لیں گے۔“ رشید نے اسے لگا دیا۔

”تو یہ بات ہے۔ ٹھہرو، پہلے میں تمہیں انگوٹھی دکھا دوں۔ پھر بات کروں گا۔“

”یہ کہہ کر اس نے جیب سے انگوٹھی نکالی اور چٹکی میں پکڑ کر ان کے سامنے لہرایا۔

”اوہ، اسی ہے۔ یہ تو واقعی جیب کتر ہے۔“ شریف کے منہ سے حیرت اور انکس کہا جس پر فرزانہ، بیگم جمشید اور خالدہ ہنس پڑیں اور محمود کا منہ بن گیا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو نہ کیا کرو۔ میں کب کہتا ہوں، مجھ سے باتیں کرو۔“

”دھت تیرے کی۔ سوار ہو گیا بھوت نوک جھونک کا۔“ فرزانہ نے ٹانگ پر ہاتھ

”تم کیا کسی بھوت سے کم ہو؟“ فاروق نے اسے بھی کھیٹا۔

”مگر میں تم پر سوار نہیں ہوں۔“ فرزانہ نے گھبرا کر کہا اور محمود نے ایک تہقہہ لگایا۔

”فرزانہ کے چٹ پٹے جواب پر۔“ محمود بولا۔

”دن رات چٹ پٹے چیزیں کھاتی رہتی ہے، باتیں کیوں چٹ پٹی نہ کرے گی۔“

”فرزانہ نے جل کر کہا۔“

”تو تم کیوں جا رہے ہو، تم بھی کھالیا کرو۔“ فرزانہ نے ہنس کر کہا۔

”میں اپنا ہاضمہ خراب نہیں کرنا چاہتا۔“ فاروق نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”بات کیا ہو رہی تھی اور پہنچ کہاں گئی۔“ بیگم جمشید نے منہ بنا کر کہا۔ خالدہ اس

دوران میں ان کی باتوں پر برابر مسکرائے جا رہی تھی۔

”نہیں تو اتنی۔ گئی تو کہیں بھی نہیں۔ بات تو یہیں کی یہیں ہے۔“ فاروق نے

جھٹ کہا اور خالدہ کھی کھی کرنے لگی۔ اسے ہنستے دیکھ کر بیگم جمشید بہت خوش ہوئیں۔

”خیر اتنا تو ہوا کہ تمہاری باتوں سے خالدہ خوش ہو گئی ہے، ورنہ چپ چپ تھی۔“

”چلے شکر ہے۔ میری باتوں کا آپ کو کوئی فائدہ نظر آیا۔ ویسے اب پھر محمود کی

”پکڑ لو اسے۔“ رشید نے چلا کر کہا۔ ”جانے نہ پائے۔“

”ظہر و بھائی ظہر و۔ پہلے میں انگوٹھی جیب میں رکھ لوں۔ اگر ان پہاڑیوں

کہیں گر گئی تو میرے اور تمہارے فرشتے مل کر بھی نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔ اور اس طرح

یہ نہ میرے کام کی رہے گی نہ تمہارے کام کی۔“ یہ کہہ کر اس نے جلدی سے انگوٹھی

کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی، پھر بولا:

اب یہ محفوظ ہے۔ کیونکہ میں نے کوٹ میں خاص قسم کی جیسیں لگوار کھی ہیں۔

میں چیز چلی تو جاتی ہے، نکلتی نہیں۔ اب بتاؤ، اس انگوٹھی کا کیا دو گئے۔“

”ایک پائی بھی نہیں۔ ہم یہ تم سے ویسے ہی حاصل کر لیں گے۔“ انور نے کہا۔

کہا۔

”بہت خوب، تو پھر کر لو۔“ اس نے کہا۔ ”آؤ اور میری جیب میں سے

نکال لو۔“

”اس کے ان الفاظ پر تینوں کو غصہ آ گیا اور وہ ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوئے۔

☆ ☆ ☆

”یہ لہا جان کہاں چلے گئے؟“ محمود نے کہا۔

”اس جیلے میں یہ غیر ضروری ہے، تم صرف اتنا جملہ بھی کہہ سکتے تھے، لہا

جنگ ہو گئی

سب سے پہلے شریف نے اُن پر چھلانگ لگائی تھی۔ یہ انسپکٹر جمشید ہی تھے جو شریف سے کرائے کے مکان کے بہانے مصافحہ کر کے کھڑے ہو گئے تھے اور اسی دوران انہوں نے انگوٹھی اڑائی تھی، کیونکہ وہ دور بین میں شریف کو انگوٹھی کوٹ کی جیب میں رکھتے دیکھ چکے تھے۔ اب جو انہوں نے ان تینوں کو واپس آ کر انگوٹھی کو تلاش کرتے دیکھا تو وہ بچوں کو کوٹھی میں وہی چھوڑ کر اس طرف نکل آئے۔ جونہی شریف نے ان پر چھلانگ لگائی، وہ تیزی سے ایک طرف ہٹ گئے۔ شریف اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔ اس کے منہ سے ایک بلند چیخ نکلی۔

”ارے ارے، یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور بہت کمزور بھی ہوں، تمہاری اس اچھل کود کو یہ دہشت نہیں کر سکوں گا، کچھ تو خیال کرو۔“ انسپکٹر جمشید نے چہرے پر گھبراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا۔

ان الفاظ کو سن کر انور اور رشید جھنجھلا اٹھے۔ انہوں نے مختلف سمتوں سے ایک ساتھ چھلانگ لگائی۔ انسپکٹر جمشید جلدی سے نیچے بیٹھ گئے اور ان دونوں کے سر آپس میں زور سے ٹکرائے۔ بالکل ایسی آواز آئی جیسے ناریل سے ناریل ٹکرائے ہوں۔

”ہائیں۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ دیکھو باز آ جاؤ۔ چوٹ لگ جائے گی۔“ وہ پھر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار طاری تھے۔

بات پر آ جانا چاہیے۔ کہیں یہ مجھے مار نہ بیٹھے۔“

”محمود نے کہا تھا کہ بتا جان کہاں چلے گئے۔“ فرزانہ نے گویا یاد دلایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔“ فاروق نے پوچھا۔

”میں کیا جانوں۔ تم ہی خیالی گھوڑے دوڑاؤ۔“ محمود بولا۔

”میں تو جانتا ہوں، اس لئے میں نے اپنے خیالی گھوڑوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔

وہ گھاس چرتے پھر رہے ہیں۔“ فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔ خالدہ بڑا براہِ اس

باتوں پر ہنس رہی تھی۔

”لاحول ولا قوۃ۔ تم اور کبھی سنجیدہ ہو جاؤ۔ یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔“ محمود

کہا۔

”اگر نہیں ہو سکتا تو پھر تم کیوں لال پیلے ہو رہے ہو۔“ فاروق کب چپ رہا

والا تھا۔

”تم نے کیا کہا فاروق! تم جانتے ہو، وہ کہاں گئے ہیں؟“

”ہاں، دور بین اٹھاؤ اور اس طرف دیکھو جہاں ان تینوں نے خالدہ کو پکڑا تھا۔“

فاروق نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

فوراً ہی فرزانہ نے دور بین اٹھائی اور اسے آنکھوں سے لگا لیا۔ ساتھ ہی اس نے

منہ سے نکلا:

”ارے۔ وہاں تو جنگ ہو رہی ہے۔“

”کیا کہا۔ جنگ۔“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

پھر جونہی وہ مڑے انہوں نے دیکھا، رشید جو ان کی طرف بڑھ رہا تھا، چلتے چلتے بندھے منہ گرا۔

”ہائیں۔ یہ تمہیں کیا ہوا۔ بغیر کسی وجہ کے ہی گر رہے ہو۔“ ان کے منہ سے نکلا۔

”ابا جان، میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی تھی۔“ فرزانہ کی آواز آئی۔

انسپکٹر جمشید نے چونک کر دیکھا۔ فرزانہ، محمود اور فاروق ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھے تھے۔ مقابلے میں اب صرف انور رہ گیا تھا۔ لیکن اس میں اب آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رہ گئی تھی۔

”آؤ یار۔ اگر کچھ کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کر لو۔“ انسپکٹر جمشید نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

”یار جیب کترے، تم جیتے اور ہم ہارے۔“ انور نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”جیب کترے۔“ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ حیرت زدہ آواز میں کہا۔

پھر فاروق بولا۔

”ابا جان، اس نے آپ کو جیب کتر کہا ہے یا ہمارے کان بجے ہیں۔“

”نہیں بیٹا، اس نے مجھے ہی کہا ہے۔ دراصل چور کو سب چوری نظر آتے ہیں۔“

رشید اور شریف اپنی چونٹوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور ہائے کر رہے تھے۔

ساتھ ہی وہ انسپکٹر جمشید کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی جن بھوت ہوں۔

”اب کیا ارادے ہیں دوستو۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”تم وہ ہمارے ہاتھوں بچ دو۔“ انور نے کہا۔

”بولو، کیا دو گے اس کا؟“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

”ابا جان، یہ لوگ آپ سے کیا چیز خریدنا چاہتے ہیں۔“ محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

اتنی دیر میں شریف اٹھ چکا تھا اور اس نے جیب میں سے چاقو نکال لیا تھا۔

چاقو لہراتا ہوا ان کی طرف آیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگے:

”ارے باپ رے۔ اب چاقو بھی نکال لیا۔ بھائی میں نے تم لوگوں کا کیا کیا ہے۔

آخر کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ چاقو جیب میں رکھ لو، میں انگوٹھی تمہارے حوالے کر دیتا ہوں۔“

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ شریف غزایا۔

”یا اللہ، یہ کس مصیبت میں پھنس گیا۔“ انسپکٹر جمشید نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

شریف نے چاقو والا ہاتھ ہوا میں زور سے لہرایا اور انسپکٹر جمشید پر وار کیا۔ انہوں نے

ایک جھکائی دی اور دوسری طرف نکل گئے۔ دوسری طرف رشید اور انور تیار کھڑے

تھے۔ انہوں نے فوراً گھونے چلائے جو ان کے کندھوں پر پڑے۔ اب تک انہوں

نے اپنے ہاتھ پر استعمال نہیں کئے تھے۔ کندھوں پر جو دو ہاتھ پڑے تو بولے:

”اب چونکہ تم مجھے مار بیٹھے ہو، اس لئے اگر میرا بھی کوئی ہاتھ لگ گیا تو زندہ

منانا۔ جب تک مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا تھا، اس وقت تک تو میں درگزر کر سکتا تھا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے پھرتی سے ایک مٹکا رشید کے جڑے پر مارا۔ وہ ہائے کی آواز

نکالا ہوا لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھ ہی انور کی کن پٹی پر بھی ایک مٹکا لگا پھر فوراً انہیں اپنا

رخ تبدیل کرنا پڑا، کیونکہ دوسری طرف سے شریف ان پر چھپنا تھا۔ شریف کا چاقو والا

ہاتھ سیدھا ان کے پیٹ کی طرف آیا۔ انہوں نے دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی

اور اپنے گھٹنے پر اس کی کلائی زور سے ماری۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں دور

جاگرا۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کی لات اس کے پیٹ میں لگی اور وہ دوڑتا ہوا

دوسری طرف الٹ گیا۔

”ایک منٹ بیٹا، میں ذرا ان سے بات کر لوں۔“ ہاں بھئی، کیا دیتے ہو اس کا؟
انہوں نے کہا۔

”پانچ سو روپے۔“ انور نے بولی دینے والے انداز میں کہا۔
”بس، صرف پانچ سو روپے۔ کچھ اور آگے بڑھو۔“ انسپکٹر جمشید نے مذاق الالہ
”چلو سات سو لے لو۔“ انور گڑگڑا کر بولا، جیسے بھیک مانگ رہا ہو۔
”نہیں بھئی، میں اس کے پچیس ہزار روپے سے کم نہیں لوں گا۔“ انسپکٹر جمشید
مسکرائے۔

”پچیس ہزار روپے اور ایک معمولی سی سونے کی انگوٹھی کے۔ تمہارا دامغ تو بچہ
چل گیا۔“ رشید نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔
”ہاں، اگر سودا منظور ہو تو پچیس ہزار روپے لے آؤ۔“ انگوٹھی میں تمہارا
حوالے کر دوں گا۔“

”انگوٹھی۔؟“ محمود، فاروق اور فرزاد کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور وہ ان
جمشید کو آنکھیں پھاڑ پھار کر دیکھنے لگے۔ ان کے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ انگوٹھی
کے پاس ہوگی۔

”ایک ہزار روپے لے لو۔ بس اس سے زیادہ نہیں دے سکتے۔“ رشید نے کہا۔
”سنو دوستو۔ تم نے ایک لڑکی کی انگوٹھی زبردستی اس کی انگلی سی نکالی ہے۔
نہیں اسے خوفزدہ بھی کیا ہے میں اس لڑکی کا انتقام لینے کیلئے تم سے آکر لڑا ہوں۔ وہ
میں لڑے بغیر بھی تم پر قابو پاسکتا تھا، لیکن میرا جی چاہ رہا تھا، تمہیں دو دو ہاتھ رہ
کر دوں تاکہ آئندہ تم کبھی کسی معصوم لڑکی کو نہ ستاؤ۔ اب میں تمہیں پولیس کے حوالہ
کروں گا۔“

”یہ کہتے ہی انسپکٹر جمشید نے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا اور ان کی طرف

دیا۔

انہو اور میرے آگے آگے چلو، اگر ذرا بھی حرکت کی تو بھیجا اڑادوں گا۔“ انہوں
نے خوف ناک لہجے میں کہا۔

☆☆☆

وہ انہیں لے کر کوٹھی پہنچے۔ خالدہ اور بیگم جمشید پہلے ہی دور بین کے ذریعے یہ
سارا منظر دیکھ چکی تھیں۔ انسپکٹر جمشید نے آتے ہی کہا۔
”بیگم، گھر میں مہمان آئے ہیں، ان کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔“
”انہوں نے میری بیٹی کو ستایا ہے۔ میں ان کے لئے ہر گز کچھ تیار نہیں کروں گی۔
وہ تمللا کر پولیس۔“

”اچھا تو پھر ذرا پولیس کو فون ہی کر دو تاکہ پولیس والے خود ہی ان کے کھانے
پینے کا بندوبست کر دیں۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
”ہاں، یہ کام میں ضرور کروں گی۔“

انہوں نے کہا اور پولیس کو فون کرنے چلی گئیں۔ پولیس نے وہاں پہنچنے میں دیر
نہیں لگائی۔ سب انسپکٹر فاضل شاید نیا آدمی تھا، وہ انسپکٹر جمشید کو نہیں جانتا تھا۔ اس
نے کرسی پر بیٹھ سارے حالات سنے۔ ان تینوں کو ہتھکڑی لگائی اور پھر ان سے پوچھا:
”وہ کون ہے جس نے تمہیں اس کام کے لئے تیار کیا تھا؟“

”ہم اسے نہیں جانتے۔ وہ ہمیں مون لائٹ ہوٹل میں ملا تھا۔ ہم ہر روز رات
کے وقت مون لائٹ ہوٹل میں بیٹھنے کے عادی ہیں۔“

”اگر تمہیں انگوٹھی مل جاتی تو تم کس وقت اسے دینے جاتے؟“

”کل شام کو۔“ انور نے جواب دیا۔

”ہوں، آپ وہ انگوٹھی مجھے دکھائیے۔“ انسپکٹر فاضل نے کہا۔

”ابھی نہیں دکھاؤں گا۔“ انسپکٹر جمشید نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ نہیں دکھائیں گے۔“ سب انسپکٹر فاضل نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں، میں بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

لیکن آپ پولیس کے کام میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے۔“ انسپکٹر فاضل نے

تیز لہجے میں کہا۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں، اس لئے جب میں اس کیس کو حل کر لوں گا تو آپ

سب کچھ بتا دوں گا۔“ انسپکٹر جمشید نے شریفانہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ آخر آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟“ سب انسپکٹر فاضل نے

حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”انسپکٹر صاحب معاف کیجئے گا۔ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں، ورنہ کبھی اس

معاملے میں اپنی ٹانگ نہ اڑاتا۔“ انسپکٹر جمشید نے شرمندگی کے انداز میں کہا۔

”آپ نے اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ انسپکٹر فاضل بولا۔

”یہی تو میں چاہتا ہوں کہ آپ میرا نام معلوم نہ کریں، لیکن معلوم ہوتا ہے، اس

طرح آپ کی تسلی نہیں ہوگی۔ اس لئے مجبوری ہے۔ نام بتانا ہی ہوگا۔ میرا نام انسپکٹر

جمشید ہے۔“ آخر انہوں نے کہا۔

”جی۔“ انسپکٹر فاضل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”اوہ۔“ خالد کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی پڑی تھیں۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ آخر فاضل نے کہا۔

”معاف کیجئے گا جناب۔ میں آپ سے اور آپ کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ بلکہ آپ کے تینوں بچوں کے کارناموں کا حال بھی آئے دن اخبارات

میں پڑھتا رہتا ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو پہچان نہ سکا؛ حالانکہ میں نہ

جانے کتنی مرتبہ آپ کی اور آپ کے بچوں کی تصویر دیکھ چکا ہوں۔ یہ ضرور محمود، فاروق

اور فرزانہ ہیں۔“

”آپ ٹھیک سمجھے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ یہ کہہ کر فاضل نے ان سب سے ہاتھ

ملا یا۔

”خالدہ، تمہارے منہ سے ’اوہ‘ کیوں نکلا تھا؟“ فاروق نے پوچھا۔

”اس لئے کہ میں بھی آپ لوگوں کے کارناموں کا حال پڑھتی رہتی ہوں۔“

خالدہ نے مسکرا کر کہا۔

”بہت خوب؛ بہر حال جناب فاضل صاحب، اب میں یہ چاہتا ہوں کہ ان

تینوں کی جگہ صرف میں کل مون لائٹ ہوٹل میں جا کر اس شخص سے ملاقات کروں جو

اس سارے پکڑ کاڑنے دار ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ چاہتا کیا ہے اور اس انگوشی

کے ساتھ کون سا راز وابستہ ہے۔ وہ اس انگوشی کا کیا کرنا چاہتا ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے

کہا۔

”اب مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں، جو آپ کا جی چاہیں کریں، یہ بتادیں

کہ ان تینوں کا کیا کیا جائے۔“ سب انسپکٹر فاضل نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”انہیں حوالات میں رکھیں۔ بعد میں ان کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“ انسپکٹر جمشید

نے کہا۔

”اچھی بات ہے، تو پھر میں انہیں لے کر چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، آپ مجھ سے ملتے رہیے گا۔ میں آپ کو حالات بتاتا رہوں گا۔“

”جی بہت بہتر۔“

سب انپکٹر فاضل اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان تینوں کو لے کر چلا گیا۔
 ”اور اب میں خالدہ کو اس کے گھر چھوڑ آنا چاہتا ہوں۔ اس کے چاہا
 یٹان ہوں گے۔“ ان کے جانے کے بعد انپکٹر جمشید نے کہا۔
 ”تو ہم بھی کیوں نہ آپ کے ساتھ چلیں۔ سیر ہو جائے گی۔“ فرزانہ بولی
 ”جیسے تمہاری مرضی۔“ انپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔
 چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

تلاشی

وہ خالدہ کے چچا کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو انہیں کسی کے چلانے کی آواز
 سنائی دی۔ کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، انہیں یوں لگا جیسے اس نے ساری کوٹھی کو سر پر اٹھا
 رکھا ہو۔

”کمبختو، جلدی کرو۔ ادھر ادھر پھیل جاؤ اور میری بچی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ نہ
 جانے وہ غریب کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا
 ہے۔ آج سے پہلے تو وہ کبھی اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہی تھی۔ میں قیامت کے دن
 بھائی جان اور بھابھی جان کو کیا منہ دکھاؤں گا، اگر خالدہ کو کچھ ہو گیا تو ان کو کیا جواب
 دوں گا۔ جلدی کرو، ورنہ میں تم سب کو ملازمت سے نکال دوں گا۔“

”حضور، ابھی جاتے ہیں، یہ لیجئے۔“ کسی ملازم کی آواز آئی۔

فوراً ہی دروازہ کھلا اور تین ملازم چہروں پر مسکراہٹیں لئے باہر نکلے مگر خالدہ اور
 دوسروں پر نظر پڑتے ہی وہ مسکراہٹیں غائب ہو گئیں۔

”بیٹا، تم آگئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو؛ ورنہ خان صاحب نے تو
 ہماری جان ہی نکال دی تھی۔ اور یہ لوگ کون ہیں؟“ ایک بوڑھے ملازم نے حیران
 ہو کر کہا۔

”یہ۔۔۔۔۔ انہوں نے آج میری بہت مدد کی ہے۔ چچا جان کو بتاؤ کہ میں آگئی

”مصیبت۔ کیسی مصیبت بیٹی۔ خدا نہ کرے کہ تم پر کوئی مصیبت آئے۔ تمہارے حصے کی ساری مصیبتیں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ تم پر آج نہ آئے۔“ وہ بڑی بوڑھیوں کی طرح بولتے چلے گئے۔

خالدہ نے تفصیل سے سارا واقعہ۔ نادیا۔ خان صاحب آنکھیں پھاڑے یہ کہانی سننے رہے۔ خالدہ کے خاموش ہونے پر بولے:

”اُف خدا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ میں تو بے موت مر جاتا۔“

”لیکن خان صاحب، کیا آپ کے بھائی نے مرتے دم آپ کو اس انگٹھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”نہیں، بالکل کچھ نہیں بتایا، اگر بتایا ہوتا تو ضرور مجھے یاد ہوتا۔“ انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

”حیرت ہے۔ پھر اس شخص کو اس انگٹھی کے بارے میں کیسے معلوم ہے جو اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولے۔

”خدا جانے، اب اس میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ خان صاحب نے فکر مند ہو کر کہا۔

”ہوں، خیر میں دیکھ لوں گا، آپ فکر نہ کریں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”یہ بتیوں آپ کے بچے ہیں؟“ خان صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ مسکرائے۔

”چچا جان، یہ انسپکٹر جمشید ہیں۔“

”کیا۔ تم۔ تم۔ سچ کہہ رہی ہو بیٹی۔“ خان صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ حیرت کے مارے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بالکل سچ۔ اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں۔“ خالدہ مسکرائی۔

ہوں اور میرے ساتھ کچھ مہمان بھی ہیں۔“ خالدہ نے کہا۔

”جی اچھا۔“ ایک ملازم نے کہا اور تینوں اٹے قدموں واپس چلے گئے۔

کوئی ڈھاڑا:

”کمبختو، تم واپس آ گئے۔ ابھی تک گئے نہیں۔ میں تمہاری ہڈیاں چبا جاؤں گا۔“

”حضور، آپ کا ہاضمہ پہلے ہی خراب رہتا ہے۔“ ایک ملازم کی آواز آئی۔

”اوہ ہاں، مجھے ایسی غلط بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیے تھی۔ خیر چھوڑ دو، تم میرے

کہ واپس کیوں آ گئے۔“ خان صاحب نے گھبرا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

”حضور بیٹا آ گئی ہیں اور اپنے ساتھ کچھ مہمان بھی لائی ہیں۔“

”ارے، وہ آ گئی ہے۔ عقل کے اندھو، تو اُسے باہر ہی کیوں چھوڑ آئے ہو۔“

”جی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ مہمان۔۔۔۔۔“ ملازم ہکھلایا۔

”جاؤ جاؤ، سب کو لے آؤ۔ بیٹیا کے مہمان بھی، ہمیں بیٹیا کی طرح ہی عزیز ہیں۔“

”یہ چچا جان ہیں۔ گھر کے ملازم اور پڑوسی انہیں پاگل اور خبطی سمجھتے ہیں۔“

کچھ میں ہی جانتی ہوں کہ یہ کتنے اچھے انسان ہیں۔ دراصل ان کے کوئی اولاد

ہے، بس مجھے ہی اپنی حقیقی اولاد دیکھتے ہیں۔“ خالدہ نے انہیں بتایا۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور تینوں ملازم پھر نمودار ہوئے۔

”بیٹا، اپنے مہمانوں کو اندر لے آئیے۔“

”وہ اندر داخل ہوئے۔ خان صاحب کافی لمبے آدمی تھے، رنگ سرخ نما

آنکھیں بھوری۔ انہیں دیکھتے ہی جان دار انداز میں مسکرائے۔

”میری بیٹی کے مہمانو، خوش آمدید۔ آپ میرے بھی مہمان ہیں۔“

”چچا جان۔ ان لوگوں نے آج مجھے ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی ہے۔“

”عجیب بے وقوف ہو۔ ارے بھائی، یہ خالده کے والد کا نام ہوگا۔ ہم نے اس سے اس کے والد کا نام کب پوچھا ہے۔“ محمود بولا۔

”اگر میں عجیب بے وقوف ہوں تو تم غریب بے وقوف ہو گے۔ ہم نے تو خان صاحب کا نام بھی نہیں پوچھا۔“ فاروق نے جھٹکا کر کہا۔

”واقعی۔ ہم سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ خیر کل جب ہم کھانا کھانے وہاں جائیں گے تو پوچھ لیں گے۔“

”تو کیا ہم وہاں کھانا کھانے جائیں گے۔“ فرزانہ نے پوچھا۔

”ہاں، وعدہ کر چکا ہوں۔ اب تو جانا ہی ہوگا اور پھر تمہاری نئی دوست خالده کا مسئلہ بھی تو حل کرنا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی لمبا چکر چل رہا ہے۔“

”ابھی تک تو اس چکر کے نہ سر کا پتا ہے اور نہ پیر کا..... ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ خالده کے والد نے مرتے وقت یہ سونے کی انگٹھی اسے دی تھی اور اس کی حفاظت کے لئے بار بار کہا تھا۔ اب کوئی شخص اس انگٹھی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہے۔ اس نے اس کام کے لئے تین بد معاشوں کی خدمات حاصل کی ہیں، لیکن وہ اس کے لئے انگٹھی حاصل نہیں کر سکے، کیونکہ درمیان میں ہم آٹکے۔“ محمود بولا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص انگٹھی حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اس کے راز سے واقف ہے۔“ فاروق بولا۔

”یہ بات تو صاف ظاہر ہے۔ ایک بے وقوف بھی سمجھ سکتا ہے۔“ فرزانہ نے اسے گھورا۔

”تو جو بات صاف ظاہر نہیں ہے، وہ تم بتا دو۔“ فاروق بھی جل کر بولا۔

”ہم یہ کیس اس وقت تک حل نہیں کر سکتے، جب تک کہ خالده کے والد کے متعلق

”اوہ۔ کمال ہے۔ جن لوگوں کے کارناموں کو میں بچوں کی طرح پڑھتا ہوں، آج وہ میرے سامنے کھڑے ہیں۔“ خان صاحب نے کہا اور پھر نہایت گرم جوشی سے ان سے ہاتھ ملایا۔

کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”اچھا جناب، اب ہم چلیں گے۔“

”کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکیں گے۔“

”بچوں کی والدہ گھر ہی رہ گئی ہیں۔ وہ کھانا تیار کر چکی ہوں گی۔ اس لئے اب تو

معاف فرمائیں۔ پھر کبھی کھالیں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے معذرت کی۔

”تو پھر کل سہی۔“ خان صاحب نے خوش دلی سے کہا۔ ”میری یہ بات تو آپ کو

ماننا ہی پڑے گی۔“

”اچھی بات ہے۔“ آخر انسپکٹر جمشید نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ وہاں سے نکل کر واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں محمود نے پوچھا۔

”ابا جان، کیا واقعی وہ انگٹھی آپ کے پاس ہے؟“

”کیا تمہیں اس میں شک ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”نہیں تو۔ کیا آپ وہ ہمیں دکھائیں گے؟“ فاروق نے کہا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔ ابھی دکھاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے انگٹھی جیب سے نکال کر ان کی طرف بڑھادی۔ یہ تقریباً

ایک تو لے کی انگٹھی تھی۔ بالکل سادہ تھی؛ البتہ اس کے اوپر لفظ ”سردار“ کھدا ہوا تھا۔

”اس میں کوئی خاص بات تو نظر نہیں آئی۔“ فرزانہ بولی۔

”بس ایک لفظ سردار ضرور لکھا ہوا ہے۔ اب پتا نہیں، یہ سردار صاحب کون

ہیں۔“ فاروق نے کہا۔

”پھر وہی ہیٹ اور عینک۔“ فرزانہ بڑبڑائی۔
 ”خیر دیکھا جائے گا۔ کل میں اس سے ملنے کے لئے مون لائٹ ہوئی میں جاؤ
 گا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

☆☆☆

ساری معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں اور یہ معلومات ہم شہر جا کر حاصل کر سکتے ہیں
 ان کے پڑوسیوں یا گھر کے ملازموں سے مل کر ہی کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“ محمود سنا
 خال نکا ہر کیا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں واپس چلنا ہوگا۔“ فرزانہ نے بچھے دل سے کہا۔
 ”ہم یہاں دس دن کے لئے آئے ہیں۔ اپنے دس دن پورے کر کے چلے
 جائیں گے۔ اب انگوشی تو ہمارے قبضے میں ہے ہی، فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔
 انسپکٹر جمشید بولے۔

”ٹھیک ہے، اتنی دیر میں شاید خالدہ اور اس کے چچا بھی واپس پہنچ جائیں۔“
 ”ہوں، وہ پہنچیں نہ پہنچیں، ہم شہر جا کر اپنا کام شروع کریں گے۔ کل تم خالدہ
 سے اس کے گھر کا پتا معلوم کر لیتا۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔
 ”جی اچھا۔“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

وہ گھر پہنچے تو بیگم جمشید ایک کرسی پر بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر
 اوپر سے رو مال باندھ دیا گیا تھا اور گھر کی تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی تھیں۔ شاید گم
 کی خوب تلاشی لی گئی تھی۔ وہ بوکھلا اٹھے۔ جلدی جلدی بیگم جمشید کو کھولا گیا۔
 ”اُف خدا، آپ کے جاتے ہی وہ اندر گھس آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔
 پھر اس نے مجھے رسیوں سے باندھ دیا اور مجھ سے کسی انگوشی کے بارے میں پوچھتا
 رہا۔ پھر اس نے سارے گھر کی تلاشی لی اور جب انگوشی کہیں نہ ملی تو مجھے اسی حالت
 میں چھوڑ کر چلا گیا۔“

”اس کا حلیہ کیا تھا؟“ انسپکٹر جمشید نے غصے کے عالم میں کہا۔
 ”لبا چوڑا آدمی تھا۔ چہرے پر ہیٹ تھا اور آنکھوں پر بڑے بڑے کالے شیشوں
 والی عینک تھی۔ چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔“

”خبردار، اپنے ہاتھ اٹھا دو..... ورنہ بھیجا پاش پاش کر دوں گا۔“

انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ہیٹ اور عینک والا ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس ناک، ہونٹ اور تھوڑی دیکھی جا رہی تھی۔ انسپکٹر جمشید نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں اور ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ پھر پرسکون لہجے میں بولے:

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”تمہاری تلاشی لوں گا۔ کیا تم انگٹھی لے کر آئے ہو؟“ اس نے تیز اور کھدے لہجے میں کہا۔

”نہیں، کیا تمہیں اس کی بہت ضرورت ہے؟“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”ہاں، بہت ضرورت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور پستول کی نال ان کی کمر سے لگا کر جیبوں کی تلاشی لینے لگا، لیکن کسی جیب سے انگٹھی برآمد نہ ہوئی۔ تلاشی دیتے ہوئے انسپکٹر جمشید بولے۔

”انگٹھی کے علاوہ میری کوئی اور چیز نہ نکالنا؛ ورنہ پچھتاؤ گے۔“

”بکومت۔“ اس نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔

”بھائی شریفوں کی طرح گفتگو کرو۔ یہ کیا بد معاشوں والی زبان استعمال کر رہے ہو۔“

”تم پھر بولے۔ اس نے پھر غزاکر کہا۔ شاید تمیز سے گفتگو کرنا، اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”بہت اچھا۔ اگر میرا بولنا تمہیں اتنا ہی ناگوار گزر رہا ہے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”انگٹھی کہا ہے؟“ ہیٹ والے نے کہا۔

انسپکٹر جمشید زخمی ہو گئے

انسپکٹر جمشید مون لائٹ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ اس سے پہلے وہ رشید، شریف اور انور سے ہوٹل کے اس کمرے کا نمبر پوچھ چکے تھے جس میں اس شخص نے تین بد معاشوں سے بات کی تھی۔ کاؤنٹر پر رک کر انہوں نے پوچھا:

”کمرہ نمبر ۳۵ کس طرف ہے؟“

”اوپر والی منزل کے دائیں طرف۔“

”شکریہ۔“ انہوں نے کہا اور زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ زینے سے وہ

دائیں طرف مڑ گئے۔ چند قدم آگے چل کر وہ کمرہ نمبر ۳۵ تک پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا؛ البتہ سامان موجود تھا۔

انسپکٹر جمشید نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کمرے میں داخل ہو گئے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی، جس پر بستر موجود تھا۔ کمرے میں ایک میز اور تین

کریاں بھی موجود تھیں۔ ایک طرف ایک سوٹ کیس رکھا تھا۔ کھونٹی سے کپڑے لٹک رہے تھے۔ انہوں نے پورے کمرے کو غور سے دیکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچے

لگے۔ دفعۃً ان کی نظر غسل خانے پر پڑی۔ اسے تو وہ بھول ہی گئے تھے۔ غسل خانے کو دیکھنا بہت ضروری تھا۔ ابھی وہ اٹھے ہی تھے کہ غسل خانے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا

اور ایک کرخت دار آواز آئی۔

جواب میں انسپکٹر جمشید خاموش رہے بلکہ انہوں نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے

کر لیے۔

”بتاتے کیوں نہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں انگوٹھی کہاں ہے۔“ اس نے اپنا بازو

دہرائی۔

”عجب مصیبت ہے، خود ہی کہتے ہو، اب نہ بولنا اور پھر کہتے ہو بولنے کی

نہیں: بہر حال انگوٹھی میرے پاس نہیں ہے۔“ انسپکٹر جمشید بھی تھلا کر بولے۔

”تو پھر کس کے پاس ہے؟“ ہیٹ والے نے تھلا کر پوچھا۔

”کالے دیو کے پاس، وہ کالا دیوانہوں کو قاف جاچکا ہے: ورنہ میں اس

درخواست کرتا کہ انگوٹھی کی ضرورت میرے بجائے تمہیں ہے، اس لئے وہ تمہیں

دی جائے۔“

”تو تم نہیں بتاؤ گے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”بتایا تو ہے اور کس طرح بتاؤں۔“

”چلو مجھ سے ایک سودا کرلو۔“ آخر اس نے تنگ آ کر کہا۔

”سودا۔ کیسا سودا؟“ انسپکٹر جمشید نے چہرے پر حیرت کے آثار طاری کر لیے۔

”اس انگوٹھی کے مجھ سے پچیس ہزار روپے لے لو۔“

”پچیس ہزار تو تم نے انور، رشید اور شریف کو بھی دینے کا وعدہ کیا تھا۔“ انہوں

نے مسکرا کر کہا۔

”چلو تمیں ہزار روپے لے لو۔“ اس نے بھیک مانگنے والے انداز میں کہا۔

”اگر اس وقت یہاں میرا بیٹا فاروق موجود ہوتا تو تمہارا جملہ سُن کر یہ ضرور

کہتا۔۔۔ کہیں چلنے کی کیا ضرورت ہے، یہیں بات کر لیتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے حیران ہو کر کہا۔

”چھوڑو، تم مطلب نہیں سمجھ سکو گے۔“

”تو تم میں ہزار روپے میں بھی انگوٹھی نہیں بیچنا چاہتے۔“ اس نے تنگ آ کر کہا۔

”بیچ کیسے سکتا ہوں۔ وہ تو ایک یتیم لڑکی کی امانت ہے۔ دیے اگر تم یہ بتا دو کہ اس

دشمنی کا راز کیا ہے تو پھر شاید تمہارے ساتھ کوئی بات کر سکوں۔“

”انگوٹھی کے بارے میں میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ اس نے کہا۔

”تو میں انگوٹھی تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔“

”سوچ لو۔ پچھتاؤ گے۔“ اس نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

”میں نے پچھتانا نہیں سیکھا، البتہ تم ضرور پچھتاؤ گے۔ کیونکہ تم مجھے نہیں جانتے

مگر تمہیں میرا نام معلوم ہوتا تو کبھی مجھ پر پتہ نہ تانتے۔ اپنے دونوں ہاتھ بھی میں

نے تمہارا دل رکھنے کے لئے اٹھا دیئے ہیں: ورنہ تمہارا یہ کھلونا تو میرا کچھ نہیں بگاڑ

سکتا۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”بہت بڑھ چڑھ باتیں بنا رہے ہو، ذرا میں بھی سنوں، تمہارا کیا نام ہے۔“

ہیٹ والے نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں ہر ایرے غیرے کو اپنا نام بتاتا نہیں پھرتا۔“

”خیر نہ بتاؤ۔“ اس نے برا سا منہ بنایا۔

اسی وقت انسپکٹر جمشید نے اپنے پیچھے قدموں کی ایک ہلکی سی آہٹ سُنی، وہ چونک

کر مڑے مگر انہیں ایک سیکنڈ کی دیر ہو چکی تھی۔ ان کے سر سے اسی وقت کوئی چیز زور

سے ٹکرائی تھی۔ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے فرش پر

☆☆☆

انسپکٹر جمشید کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ چلتے وقت انہوں نے کہا تھا کہ وہ دوپہر

نے آتے ہی کہا:

”فرمائیے جناب، خیریت تو ہے۔“

”آپ اس ہوٹل کے مالک ہیں؟“ فاضل نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے ادب سے کہا۔

”آپ کا نام؟“

”جی، مجھے مرزا انوار بیگ کہتے ہیں۔“

”تو انوار بیگ صاحب، ہم آپ کا کمرہ نمبر ۳۵ دیکھنا چاہتے ہیں۔“ فاضل نے

سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”چلیے جناب، خیریت تو ہے؟“

”ہاں، خیریت ہی ہے۔“ وہ سب کمرہ نمبر ۳۵ کے سامنے آئے۔ دروازہ بند تھا۔

مرزا انوار بیگ نے دروازے پر لگی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ اندر گھنٹی بجی لیکن کوئی دروازے

پر نہ آیا۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد محمود نے دروازے کو ہاتھ سے دھکیلا۔ دروازہ

کھلتا چلا گیا۔

وہ سب چونک اٹھے۔ انسپکٹر جمشید کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑے تھے اور ان

کے سر سے خون بہہ کر فرش پر جم چکا تھا۔

☆☆☆

کے کھانے کے وقت تک آجائیں گے لیکن وہ نہ جانے کب سے کھانے کی میز پر انتظار کر رہے تھے۔ کھانا بھی رکھے رکھے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آخر فرزانہ نے سہاگہ کی پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔ دل تو میرا بھی یہی کہہ رہا ہے۔“ محمود بولا۔

”تو پھر کیوں نہ سب انسپکٹر فاضل کو فون کر دیں اور خود بھی مون لائن ہوٹل جائیں۔“ فاروق نے تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے، ہمیں یہی کرنا چاہیے۔ کیوں اتنی جان؟“ فرزانہ بولی۔

”بالکل ٹھیک۔“ بیگم جمشید بولیں۔ وہ کافی فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

آخر محمود نے سب انسپکٹر فاضل کو فون کیا اور اسے سارا حال کہہ سنایا۔ اس نے

مون لائن ہوٹل پہنچنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ وہ بھی پہنچ رہے ہیں۔

فوراً ہی وہ روانہ ہو گئے اور عین اس وقت ہوٹل کے سامنے پہنچے جب سب اپنے فاضل اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔

”بہت خوب، ہم ایک ساتھ پہنچے۔“ اس کے لہجے سے تعریف جھلک رہی تھی۔

”شکریہ جناب، ہمیں سب سے پہلے کمرہ نمبر ۳۵ دیکھنا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے کہا۔

وہ اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر والا پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ فاضل نے کہا:

”گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم صرف کمرہ نمبر ۳۵ دیکھیں گے۔ کیا ہوٹل

فیجر اس وقت موجود ہے۔“

”جی ہاں، ہوٹل کے مالک خود ہی فیجر بھی ہیں۔“

”بہت خوب، تو انہیں بلاؤ۔“

فیجر نے ان تک پہنچنے میں دیر نہ لگائی۔ یہ ایک لمبا چوڑا آدمی تھا۔ سر سے گنجھا تھا۔

اچانک واپسی

کر لو اور معلوم کرو کہ اس پتے پر اس نام کا کوئی آدمی رہتا ہے یا نہیں۔ ویسے تو میرا خیال ہے کہ نام اور پتہ فرضی ہی ثابت ہوگا۔“

”جی بہت اچھا۔“ فاضل جلدی سے بولا۔

ڈاکٹر نے ان کے گھر جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ زخم خطرناک نہیں تھا۔ شام کے وقت فاضل نے آکر بتایا کہ ان کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ اس نام کا اُس پتے پر کوئی آدمی نہیں رہتا۔ یہ سن کر انسپکٹر جمشید نے کہا تھا:

”کوئی بات نہیں۔ وہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔“

اسی شام وہ خان صاحب کے گھر کھانے پر پہنچ گئے۔ خالدہ اور خان صاحب انسپکٹر جمشید کے سر پر پٹی بندھے دیکھ کر گھبرا گئے۔

”یہ کیا ہوا؟“ خالدہ کے منہ سے نکلا۔

”یا اللہ رحم؟“ خان صاحب بولے۔

”یہ اسی انگٹھی کے سلسلے میں ہوا۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”اوہ۔“ خالدہ ہکا بکا رہ گئی۔

”یہ ضرور کوئی لمبا چکر ہے۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔ آپ لوگ کب واپس جا رہے

ہیں؟“

”چار دن بعد۔“ خان صاحب نے

”بس ٹھیک ہے، اس کیس کی باقی تفتیش شہر چل کر ہی ہوگی۔“ انہوں نے بتایا۔

”تو کیا ہیٹ والا بھی وہیں ہوگا۔“ خان صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

”امید تو ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے، چکر کچھ کچھ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہے۔“ فاروق نے کہا۔

”کیوں، تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو؟“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

یہ دیکھ کر وہ بُری طرح گھبرا گئے۔ انسپکٹر جمشید کو اٹھا کر چار پائی پر ڈالا گیا۔ ڈاکٹر فون کیا گیا۔ مرزا انور بیگ بُری طرح گھبرا گیا تھا اس نے کہا:

”مم۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ وہ آدمی نہیں جو اس کمرے میں ٹہرا ہوا تھا۔ وہ تو ہر وقت

ہیٹ اوڑھے اور عینک پہنے رہتا تھا۔“

”ہاں، یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ وہ شاید بھاگ گیا ہے۔ خیر ہم اسے دیکھ لیں گے۔“

سب انسپکٹر فاضل نے کہا۔

چند منٹ بعد ہی ڈاکٹر پہنچ گیا۔ اس نے انسپکٹر جمشید کو ایک انجکشن دیا، سر پر پٹی باندھی اور گھڑی دیکھنے لگا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا بُرا حال تھا۔ آخر ٹھیک تین منٹ بعد انسپکٹر جمشید نے آنکھیں کھولیں، انہیں اپنے اوپر جھکے دیکھ کر مسکرائے اور بولے:

”کیا وہ بھاگ گیا؟“

”کون؟“ فاضل نے پوچھا۔

”وہی ہیٹ والا۔“

”ہم ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ کمرے میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔“ فاضل نے انہیں بتایا۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ اس ہیٹ والے کا نام اور پتہ ہوٹل کے رجسٹر میں سے نوٹ

”ابھی ابھی آپ نے کہا ہے تاکہ باقی کیس شہر چل کر ہی حل ہوگا۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے کچھ اندازے تو لگائے ہیں۔ اب اندازوں کی بنیاد پر آگے بڑھنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں خاں صاحب میرے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ہاں۔ ضرور، میں تو جلد از جلد یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر یہ چکر کیا کون ہے جو انگوٹھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”آپ کا اور آپ کے بھائی کا نام کیا ہے، یعنی خالدہ کے والد کا۔“

”میرا نام وقار خان ہے اور میرے بھائی کا نام سردار احمد خان تھا۔“

”کیا وہ بہت مالدار آدمی تھے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں، ان کی یہاں کافی زمین اور جائیداد ہے، جس کی اب خالدہ مالک ہے۔ کیا اس زمین اور جائیداد کا انتظام آپ کے ہاتھ میں ہے؟“

”ہاں۔“ خان صاحب یہ کہتے وقت سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے۔

”آپ یہ تو خیال نہیں کر رہے کہ یہ سارا چکر میں چلا رہا ہوں۔“

”نہیں، ویسے ہمیں ہر کیس کا جائزہ ہر پہلو سے لینا پڑتا ہے۔ آپ کوئی خیال کریں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

”کیا سردار صاحب کبھی ملک سے باہر بھی رہے ہیں؟“

”ہاں، نیروبی میں کئی سال رہے ہیں۔ وہاں بھی انہوں نے کاروبار ہے۔“ خان صاحب نے بتایا۔

”یہ کاروبار کس قسم کا تھا؟“

”یہ تو انہوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ وہ اچانک واپس آ گئے تھے اور اچانک

ی کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔“ خان صاحب بولے۔

”وہ کن حالات میں فوت ہوئے، انہیں کیا بیماری تھی؟“

”وہ دل کے دورے سے فوت ہوئے ہیں۔ ان پر دل کا دورہ پہلے بھی پڑتا رہا ہے۔“

”ہوں، خیر میں دیکھوں گا کہ خالدہ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ یہ چکر تو سلجھتا ہوا نظر نہیں آتا۔ شاید میری زندگی کا یہ پہلا کیس ہے کہ اتنے واقعات پیش آچکے ہیں،

لیکن میں ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔“

”تبا جان، کیا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ اس کیس کو حل نہیں کر سکیں گے۔“ محمود نے چونک کر کہا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ہمت ہارنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں۔ دراصل ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آیا۔ سرا ہاتھ آنے کی دیر ہے، پھر اسے جلد

حل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“

”سوال یہ ہے کہ سرا کہاں سے ہاتھ آئے گا۔ مجھے تو اس کیس میں سرے سے کوئی سرا نظر ہی نہیں آرہا۔“ فاروق نے شوخ انداز میں کہا اور دوسرے مسکرانے لگے۔

اچانک انسپکٹر جشید کو کوئی خیال آیا۔ وہ چونک اٹھے اور بولے:

”خان صاحب، ایک سوال اور۔“

”ہاں ہاں۔ فرمائیے۔“ انہوں نے کہا۔

”صرف اتنا بتادیں کہ سردار احمد خان نے کسی وکیل کی خدمات بھی حاصل کر رکھی

تھیں۔“

”ان کے ایک وکیل سے تعلقات تو تھے لیکن مرتے وقت انہوں نے خالدہ کو

میرے حوالے ہی کر دیا تھا کیونکہ انہیں مجھ پر بھروسہ تھا اور یہ یقین تھا کہ میں اس کا حق

”کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تاجا جان کہاں گئے ہیں؟“ محمود نے ٹیکسی روانہ ہونے کے بعد کہا۔

”ہاں، لگا سکتا ہوں۔“ فاروق بولا۔

”تو بتاؤ نا؟“ محمود نے جھل کر کہا۔

”تم نے صرف یہ پوچھا تھا کہ میں اندازہ لگا سکتا ہوں یا نہیں۔“ فاروق مسکرایا۔

”فرزانہ تم بتاؤ، یہ تو ہر وقت مذاق کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے۔“

”ہوا کے گھوڑے پر سوار ہونا تو سنا تھا، یہ مذاق کے گھوڑے پر سوار ہونا پہلی بار ہی سنا ہے۔“ فاروق بھلا کب چپ رہنے والا تھا۔

”میں بتا سکتی ہوں کہ تاجا جان کہاں گئے ہیں۔“ فرزانہ بھی چپکی۔ اس کے چہرے پر شریسی مسکراہٹ تھی۔

”دھت تیرے کی۔ تم بھی فاروق کی نقل کرنے لگیں۔“ محمود نے جھنجھلا کر کہا۔

”نہیں تو، میں نے ایسا نہیں کہا۔ ہاں تو سنا، تاجا جان ضرور اس وکیل سے ملنے گئے ہیں جن سے خالدہ کے والد سردار احمد کے تعلقات تھے۔“

”بہت خوب، میرا اپنا بھی یہی خیال ہے۔“

”تو پھر ہم سے کیوں پوچھ رہے تھے؟“ فاروق نے جل کر کہا۔

”رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔“

”آخر وہ سراسر اکون سا ہے جو تاجا جان کے ہاتھ آ گیا ہے۔“ فرزانہ نے کہا۔

”یہی وکیل صاحب، اور کون سا سرا ہو سکتا ہے۔“ فاروق بولا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، خالدہ کا چچا اس کی ساری دولت حاصل کرنے کے لئے کوئی گہری چال چل رہا ہے۔“ محمود نے کہا۔

”ہو سکتا ہے، یہی بات ہو۔ لیکن خان صاحب تو بہت اچھے آدمی دکھائی دیتے

نہیں ماروں گا۔“

”اس وکیل کا نام کیا ہے جس سے اس کے تعلقات تھے؟“

”اس کا نام راجہ عزیز احمد ہے اور وہ شہر کا مشہور وکیل ہے۔“ خان صاحب

بتایا۔

”بہت خوب، میرا خیال ہے کہ اب یہ کیس حل ہو جائے گا۔“ انسپکٹر جمیل

اچانک کہا۔

”کیوں، کیا آپ کے ہاتھ میں کوئی سرا آ گیا ہے؟“ فرزانہ نے جلدی

پوچھا۔ محمود اور فاروق بھی چونک سے گئے۔

”ہاں۔“ انسپکٹر جمیل نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہم آج اور اسی وقت واپس چل رہے ہیں۔“

”جی۔“ تینوں حیرت زدہ رہ گئے۔

خان صاحب بھی انہیں مذی طرح گھور رہے تھے۔

☆☆☆

خان صاحب کا اعظم گڑھ میں ابھی چند دن اور ٹھہرنے کا پروگرام تھا لیکن جب

انہوں نے انسپکٹر جمیل کو واپسی کے لئے تیار دیکھا تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی واپس

جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے اور اس طرح وہ اکٹھے ہی شہر پہنچے۔ اسٹیشن پر پہنچنے ہی

انسپکٹر جمیل نے بچوں سے کہا:

”تم اپنی انی کو لے کر گھر چلو۔ میں تھوڑی دیر بعد پہنچوں گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے

خان صاحب سے ہاتھ ملایا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ خان صاحب نے

بھی ایک ٹیکسی لی اور خالدہ اور اپنے ملازموں کے ساتھ اس میں روانہ ہو گئے۔ اتنی دیر

میں انہوں نے بھی ایک ٹیکسی مل چکی تھی۔

ہیں۔“ فرزانہ بولی۔

”بہت اچھے دکھائی دینے والے اکثر اندازے بہت خوفناک نکلتے ہیں۔“ محمود نے کہا۔

”ہوں۔ مجھے بھی یہی شخص مجرم نظر آتا ہے۔“ فاروق بولا۔

”ابا جان کو چاہیے تھا، وکیل صاحب کے ہاں ہمیں بھی لے جاتے۔“ فرزانہ نے کہا۔

”پھر اتنی جان کو گھر کون لے جاتا؟“ فاروق ایک دم بولا۔

”ضروری تو نہیں تھا کہ وہ اسی وقت اس سے ملنے جاتے۔ کل کسی وقت بھی مل سکتے تھے۔“

”اب یہ تو وہی جانتے ہیں، وکیل سے جلدی یا دیر سے ملنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”یہ چکر میری سمجھ میں آیا تو نہیں۔“ فرزانہ نے اکتا کر کہا۔

”تمہاری کیا، کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا۔“ محمود نے کہا۔

”نہیں، میرا خیال ہے، ابا جان سمجھ گئے ہیں؛ ورنہ وکیل سے ملنے میں اتنی جلدی نہ کرتے۔“ فاروق نے ہڈ زور لہجے میں کہا۔

”ہو سکتا ہے، تمہارا خیال ہی ٹھیک ہو۔“ فرزانہ بولی۔

”تم دیکھ لینا۔ اس کیس کا مجرم خالدہ کا چچا ہی نکلتے گا۔“ فاروق نے کہا۔

”اچھا دیکھ لیں گے۔“ محمود نے معصومانہ انداز میں کہا اور فرزانہ اور بیگم جمشید مسکراتے لگیں۔

”اب تم مذاق کر رہے ہو۔“ فاروق نے جل بھن کر کہا۔

”کیا میرے لئے مذاق کرنا گناہ ہے۔“ محمود بولا۔

”تو پھر مجھے کیوں روکا کرتے ہو۔“ فاروق نے جھنجھاکر کہا۔

”اب نہیں روکوں گا۔“ محمود نے سہم کر کہا۔

”بھئی واہ، آج تو محمود فاروق کو چوٹ پر چوٹ دے رہا ہے۔“ فرزانہ خوش ہو کر بولی۔

”تمہیں بھی زکام ہوا۔“ فاروق نے کہا۔

”میں مینڈکی تو نہیں ہوں۔“ فرزانہ نے بھی جملہ چست کیا۔

”آج تو یہ دونوں میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ میری خیر معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن

ایک چپ سو کو ہراتی ہے..... لہذا میں چپ ہو جاتا ہوں۔“

فاروق نے اپنے آپ سے کہا اور ہونٹ مضبوطی سے بھیج کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد

انہوں نے لاکھ کوشش کی کہ اس کا منہ کھلوا سکیں مگر اس نے ہونٹ ایک دوسرے پر

سے نہیں ہٹائے۔

بیگم جمشید اس کی طرف دیکھ کر برابر مسکراتی تھیں۔

☆☆☆

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“ راجہ عزیز احمد نے بتایا۔
 ”کیا انہوں نے آپ کے پاس کوئی وصیت نامہ محفوظ کرایا تھا۔“ انسپکٹر جمشید نے
 کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔
 ”جی نہیں۔“

”کیا آپ کو یقین ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔
 ”کیا مطلب۔ اس میں یقین کا کیا سوال؟ اگر انہوں نے وصیت نامہ لکھوایا ہوتا
 تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔“ راجہ عزیز احمد نے حیران ہو کر جواب دیا۔
 ”ہوں، سردار احمد خان کے اپنے بھائی وقار احمد خان کے بارے میں کیسے
 خیالات تھے؟“

”کچھ اچھے نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بھائی لالچی آدمی ہے۔“

”کیا آپ وقار احمد سے ذاتی طور پر واقف ہیں؟“

”جی ہاں، کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔“

”کیا آپ ان کے بھی وکیل ہیں؟“

”نہیں، انہوں نے مجھ سے کوئی کام نہیں لیا۔“

”بس جناب، مجھے یہی باتیں معلوم کرنی تھیں۔“ انسپکٹر جمشید نے اٹھتے ہوئے

کہا۔

”لیکن آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ان سوالات کا مقصد کیا ہے؟“ راجہ عزیز نے

پوچھا۔

”کیا آپ جانتے ہیں، آپ کے دوست سردار احمد خان کی ایک بیٹی بھی ہے۔“

جس کا نام خالدہ ہے۔“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں، وہ تو مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔“ راجہ

تارا آ گیا

راجہ عزیز احمد کا دوست بہت شاعر تھا۔ اس کی پریکٹس بھی بہت زوردار تھی۔
 ری تھی۔ معمولی سے معمولی کیس کی بھی وہ دو ہزار روپے سے کم فیس نہیں لیتا تھا۔
 جمشید کو اس نے فوراً ہی بلوایا اور ان کے بیٹھے ہی کہنے لگا:

”میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں، اسی لئے میں نے آپ کو فوراً بلایا
 ہے کیونکہ کوئی بہت ہی اہم کام ہوگا جس کی وجہ سے آپ کو میرے پاس آنا پڑا۔“
 ”جی بس یہی سمجھ لیں۔ دیے اگر آپ اس وقت مصروف ہوں تو میں پھر کسی وقت
 حاضر ہو جاؤں۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، آپ بتائیے کس لئے تکلیف کی ہے۔“ اس
 نے بااخلاق لہجے میں کہا۔

”میں چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”ضرور فرمائیے۔ لیکن پہلے یہ تو فرمائیں، سوالات کس سلسلے میں کرنا چاہتے
 ہیں۔“

”آپ سردار احمد خان کو جانتے ہیں۔“

”جی ہاں، وہ میرے دوست تھے۔“

”ان کا نیردہی میں کس چیز کا کاروبار تھا۔“

عزیز نے کہا۔

”میں یہ سب اس لئے کہہ رہا ہوں۔ کوئی شخص کسی گھر سے چکر میں ہے۔ وہ ہاں۔“

”جی اچھا۔“

وہ اکرام کو فون کر کے واپس آئے تو فاروق نے پوچھا:

”ہاں، اب بتائیے، کہ مجرم کون ہے، وہ کیا چاہتا ہے، انگلی کا راز کیا ہے؟“ وہ بولتا چلا گیا۔

”کچھ ہمیں بھی پوچھنے کا موقع دو گے یا سب کچھ خود ہی پوچھ ڈالو گے۔“ محمود نے جل کر کہا۔

”لو۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں، تم پہلے پوچھ لو۔“ فاروق مسکرایا۔

”بس بس، لڑو نہیں؛ ورنہ تہا جان کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔“ فرزانہ گھبرا گئی۔

”بالکل ٹھیک۔ اگر تم نے اپنی نوک جھونک جاری رکھی تو میں سونے کے لئے چلا جاؤں گا اور اس طرح جو بات تمہیں ابھی معلوم ہو سکتی ہے، وہ کل معلوم ہوگی۔“

”تہا جان، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب نہیں بولوں گا اور نہ بحث کروں گا۔“ محمود نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”میں بھی آج کے لئے توبہ کرتا ہوں۔“ فاروق نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”میرے حلق سے بھی اب آواز نہیں نکلے گی۔“ فرزانہ کبکچ رہنے والی تھی۔

”یہ تمہیں پھپھو ہوئے ہو۔“ انسپکٹر جمشید جھنجھلا اٹھے۔

”اوہ۔ ارے۔“ ان کے منہ سے بولکھلا ہٹ میں نکلا اور پھر انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لئے۔

انسپکٹر جمشید اور بیگم نے بغیر نہ رہ سکے۔ آخر وہ بولے:

”ہاں، میں جان چکا ہوں کہ مجرم کون ہے؟“

”تو پھر بتائیے نا، کون ہے؟“

”تمہیں کم از کم دو دن انتظار کرنا ہوگا۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

”دو ایک دن ٹھہر جائیں پھر آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔“

”دو ایک دن تک۔ کیا آپ معاملے کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں؟“ راجہ عزیز کے منہ سے نکلا۔

”ہاں، میں بہت جلد مجرم کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اس وقت ساری بات آپ کو بتاؤں گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ راجہ عزیز نے کہا۔

اور انسپکٹر جمشید اس کے دفتر سے نکل آئے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ سیدھے ہیڈ پوسٹ آفس آئے اور کسی کو ایک لمبا چوڑا تار دیا پھر وہ واپس پہنچے۔ بیگم جمشید اور بچے بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی فرزانہ بولی۔

”تہا جان۔ آپ راجہ عزیز سے مل کر آرہے ہیں۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”سنائیے کیسا رہا۔ کیا ان سے مل کر کیس میں کچھ مدد ملی۔ محمود نے پوچھا۔“

”ابھی تک نہیں، ویسے مجھے امید ہے کہ ایک دو دن تک میں مجرم پر ہاتھ ڈال لوں گا۔“

”کیا آپ جان گئے ہیں کہ مجرم کون ہے؟“ فرزانہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”میں ذرا اکرام کو فون کر آؤں۔ اُسے کچھ ہدایات دینی ہیں۔ پھر آ کر بتاتا

”دو دن۔ یہ تو بہت لمبا عرصہ ہے۔“

”مجبوری ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”تو آپ ابھی کیوں نہیں بتا دیتے۔“ محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

”مجھے ایک تار کا انتظار ہے۔ دراصل ابھی مجھے خود بھی یقین نہیں ہے۔ تار کے بعد میں یقین سے کچھ کہہ سکوں گا۔“

”پہلے اتنا بتادیں، تار کہاں سے آنے والا ہے۔“ فاروق نے پوچھا۔

”تیرو بی سے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا اور وہ اچھل پڑے۔

☆☆☆

تیسرے دن تار آ گیا۔ انسپکٹر جمشید اسے پڑھ کر مسکرا دیئے، پھر انہوں نے اکرام کو کچھ ہدایات دیں اور راجہ عزیز کو فون کیا۔

”ہیلو راجہ صاحب، میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ دو دن بعد کچھ بتا سکوں گا۔ لہذا میں آپ کو سب کچھ بتانے کے لئے تیار ہوں کہ خالدہ کے ساتھ کیا چکر چلا رہا ہے، اس لئے آپ آج شام چار بجے میرے غریب خانے پر تشریف لے آئیں۔ خالدہ اور اس کے چچا بھی آرہے ہیں۔“

”اچھی بات ہے میں پہنچ جاؤں گا۔“ راجہ عزیز کی آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے خان صاحب کو فون کیا اور ساری بات بتائی۔ انہوں نے بھی خالدہ سمیت آنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد وہ گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو بتایا:

”میں آج مجرم کو گرفتار کر رہا ہوں۔“

”ارے، کیا تار آ گیا؟“ محمود کے منہ سے نکلا۔

”ہاں، سب لوگ چار بجے یہاں آ جائیں گے۔ ان میں سے ایک مجرم بھی

ہوگا۔“

”وہ کون ہے؟“ فرزانہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”معلوم ہوتا ہے، تم کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔“ انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

”یہ کیس ہی ایسا اوٹ پٹا ٹنگ ہے، اندازہ کیا لگائیں۔“ فاروق نے نمہ اساتذہ

بنا کر کہا۔

”پھر بھی کچھ اندازہ لگایا ہوگا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، خالدہ کے چچا خان صاحب ہی اصل مجرم ہیں۔ وہ

اس کی جاسید اور زمین پر خود قبضہ کرنا چاہتے ہوں گے۔“ محمود نے خیال ظاہر کیا۔

”میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔“ فرزانہ بولی۔

”اب میں کیا کہوں۔“ دل خان صاحب کو مجرم ماننے پر کس طرح تیار نہیں ہوتا:

بہر حال یہ دونوں انہیں ہی مجرم بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو میں بھی کہے دیتا ہوں کہ

وہی مجرم ہوں گے۔“ فاروق نے بے چارگی کے عالم میں کہا، جس پر انسپکٹر جمشید بے

ساختہ مسکرا دیئے۔

”خیر کوئی بات نہیں، آج شام چار بجے معلوم ہو جائے گا۔“ انہوں نے کہا۔

”تو آپ ابھی کیوں نہیں بتا دیتے۔“

بھئی جو مزہ سب کے سامنے بتانے میں ہے، وہ صرف تم تینوں کو بتانے میں

نہیں آئے گا۔

”اچھا، جیسے آپ کی مرضی۔“ فاروق نے مایوس ہو کر کہا۔

ٹھیک پونے چار بجے انکے دروازے کی گھنٹی بجی۔ محمود دروازہ کھولنے گیا۔ باقی

لوگ برآمدے میں بیٹھے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ جوں ہی محمود نے دروازہ

کھولا، سب لوگ چونک اٹھے؛ البتہ انسپکٹر جمشید کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ

تھی۔
دروازے پر سب انکڑا کرام کھڑا تھا۔ اسکے چہرے پر ایک پُر اسرار مسکراہٹ
جو انکڑ جشید سے کچھ کہہ رہی تھی۔

جرم کی کہانی

☆☆☆

”انہیں لے آئے ہو یا نہیں۔“ انکڑ جشید نے اکرام سے پوچھا۔
”جی ہاں، جیب میں چھوڑ آیا ہوں۔ جب آپ فرمائیں گے، لے آؤں گا۔“
اکرام نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے، چار بجنے میں دس بارہ منٹ باقی ہیں۔ بس وہ لوگ آنے ہی والے
ہوں گے۔ تم دوکان شیل ان کے پاس چھوڑ دو۔“
”جی اچھا۔“ اکرام نے کہا۔
”اور جیب کو ایک طرف لے جا کر کھڑی کر دو۔ دیکھو۔۔۔ آنے والوں کی نظر
جیب پر نہ پڑے۔“
”جی اچھا۔“ اکرام نے کہا اور باہر نکل گیا۔
”ابا جان، ہم حیران ہیں، یہ آپ کن کا ذکر کر رہے ہیں۔“ فرزانہ نے بے چین
ہو کر کہا۔
”بس بیٹا چند منٹ کی بات ہے، پھر سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا۔“
”جی اچھا۔ اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔
پھر ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ ٹھیک چار بجے گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ خالدہ
اور خان صاحب آئے تھے۔ وہ خالدہ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ فرزانہ تو اس سے

پٹ گئی۔ خوشی ان کے چہروں سے پھوٹی پڑی تھی۔ ان کے ساتھ ہی دو تین آدمی آئے تھے، مگر وہ انہیں نہیں پہچانتے تھے۔
 ”آج اس انگوٹھی کا راز حل ہو رہا ہے۔“ فرزانہ نے اس کے کان میں کہا۔
 ”خدا کا شکر ہے۔“ خالدہ نے خوش ہو کر کہا۔
 اتنے میں گھٹی ایک بار پھر بجی۔
 ”یہ راجہ عزیز ہوں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔ محمود انہیں لینے چلا گیا اور جب راجہ عزیز بھی آکر بیٹھ گئے تو انسپکٹر جمشید نے ایک کانسٹیبل سے کہا:
 ”خادم حسین، تم جا کر اکرام کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا، ابھی تنہا ہی آئے۔“
 ”جی اچھا۔“ کانسٹیبل نے کہا اور اکرام کو بلانے چلا گیا۔
 جلد ہی اکرام بھی وہاں موجود تھا۔ آخر انسپکٹر جمشید نے کہنا شروع کیا:
 ”اب جبکہ سب لوگ یہاں جمع ہو چکے ہیں، میں اصل معاملے کی طرف آتا ہوں۔ دراصل کہانی یہ ہے کہ خالدہ کے والد سردار احمد خان بہت دولت مند تھے۔ ایک بار وہ نیروبی گئے اور انہوں نے وہاں بڑے درختوں کا ایک جنگل خرید لیا۔ کئی سال وہاں رہے اور خوب منافع کمایا۔ یہ اپنی دولت وہیں جمع کرتے رہے، یہاں جمع کرادی۔ وہاں چند ایماندار ملازم چھوڑے اور واپس آ گئے، لیکن آنے سے پہلے بنک والوں کو اپنی انگوٹھی سے مہر لگا کر دے آئے۔ یہ انگوٹھی وہ چھوٹی انگلی میں پہنے رہتے تھے۔ انہوں نے بنک والوں سے کہا کہ ان کی ایک بیٹی ہے، جب وہ جوان ہو جائے گی تو اس ساری دولت کو لینے آئے گی۔ اس کے پاس یہ انگوٹھی ہوگی۔ اس سے مہر لگا کر دیکھ لیجئے گا۔ اگر دونوں مہر مل جائیں تو سارا حساب کتاب اس کے حوالے کر دیں۔ بنک والوں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ سردار احمد خان تو

وطن واپس آ گئے لیکن ریز کی کاشت سے ہر سال جو منافع ہوتا رہا، وہ بنک میں جمع ہوتا رہا۔ سردار احمد خان جب تک زندہ رہے، نیروبی بنک اور اپنے ملازموں سے خط و کتابت کرتے رہے لیکن یہ راز انہوں نے یہاں کسی کو بھی نہ بتایا، پھر بھی انہیں کسی نہ کسی کو بتانا ہی پڑتا کیونکہ خالدہ تو ابھی چھوٹی ہی تھی۔ خان صاحب کو بتاتے ہوئے انہیں ڈر لگتا تھا۔ دراصل سردار احمد خان دل کے مریض تھے۔ دل کا دورہ انہیں کئی بار پڑ چکا تھا۔ اس لئے انہیں اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر یہ راز اپنے بھائی کو بتایا تو کہیں وہ خود ان کی بیٹی کی دولت حاصل نہ کر لیں۔ بہت دنوں تک وہ اس کفر میں رہے کہ آخر بتائیں تو کسے بتائیں۔ وہ ایک ایسا آدمی چاہتے تھے جو ان کی بیٹی کی ہر طرح مدد کرے اور وقت آنے پر خود جا کر اسے اس کا حق دلادے۔ ایسے میں ان کی نظر اپنے ایک دوست پر پڑی۔ انہوں نے سوچا، ایسے معاملے میں دوست سے زیادہ کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے دوست سے بات کی۔ دوست تیار ہو گیا۔ اس وقت اس دوست کے ذہن میں کوئی بات نہ تھی، لیکن سردار احمد خان کے مرنے کے بعد اس کا ایمان ڈول گیا۔ اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ خالدہ کے پاس تو یہاں بھی کافی دولت ہے، وہ اتنی دولت کا کیا کرے گی، کیوں نہ نیروبی والی دولت وہ حاصل کر لے۔ یہ خیالات ان کے ذہن میں پلتے رہے، پکتے رہے اور آخر اس نے اس دولت کو حاصل کرنے کی ترکیب سوچ لی۔ ”انسپکٹر جمشید یہاں تک کہہ کر رک گئے۔“

”ابا جان، اس دوست کا نام آپ نے نہیں بتایا۔“ فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔
 ”میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں ہر ایک کی وضاحت کروں گا اور ثبوت بھی پیش کروں گا۔ میں نے اس کیس کا ہر طرح سے جائزہ لیا ہے۔ معلومات پوری طرح حاصل کی ہیں۔ آپ سب کو یونہی یہاں نہیں بلایا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ سردار احمد

پٹ گئی۔ خوشی ان کے چہروں سے پھوٹی پڑی تھی۔ ان کے ساتھ ہی دو تین آدمی آئے تھے، مگر وہ انہیں نہیں پہچانتے تھے۔
 ”آج اس انگوٹھی کا راز حل ہو رہا ہے۔“ فرزانہ نے اس کے کان میں کہا۔
 ”خدا کا شکر ہے۔“ خالدہ نے خوش ہو کر کہا۔
 اتنے میں گھٹی ایک بار پھر بجی۔
 ”یہ راجہ عزیز ہوں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔ محمود انہیں لینے چلا گیا اور جب راجہ عزیز بھی آکر بیٹھ گئے تو انسپکٹر جمشید نے ایک کانسٹیبل سے کہا:
 ”خادم حسین، تم جا کر اکرام کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا، ابھی تنہا ہی آئے۔“
 ”جی اچھا۔“ کانسٹیبل نے کہا اور اکرام کو بلانے چلا گیا۔
 جلد ہی اکرام بھی وہاں موجود تھا۔ آخر انسپکٹر جمشید نے کہنا شروع کیا:
 ”اب جبکہ سب لوگ یہاں جمع ہو چکے ہیں، میں اصل معاملے کی طرف آتا ہوں۔ دراصل کہانی یہ ہے کہ خالدہ کے والد سردار احمد خان بہت دولت مند تھے۔ ایک بار وہ نیروبی گئے اور انہوں نے وہاں بڑے درختوں کا ایک جنگل خرید لیا۔ کئی سال وہاں رہے اور خوب منافع کمایا۔ یہ اپنی دولت وہیں جمع کرتے رہے، یہاں جمع کرادی۔ وہاں چند ایماندار ملازم چھوڑے اور واپس آ گئے، لیکن آنے سے پہلے بنک والوں کو اپنی انگوٹھی سے مہر لگا کر دے آئے۔ یہ انگوٹھی وہ چھوٹی انگلی میں پہنے رہتے تھے۔ انہوں نے بنک والوں سے کہا کہ ان کی ایک بیٹی ہے، جب وہ جوان ہو جائے گی تو اس ساری دولت کو لینے آئے گی۔ اس کے پاس یہ انگوٹھی ہوگی۔ اس سے مہر لگا کر دیکھ لیجئے گا۔ اگر دونوں مہر مل جائیں تو سارا حساب کتاب اس کے حوالے کر دیں۔ بنک والوں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ سردار احمد خان تو

خان کے دوست نے ان کی بیٹی کی نیردلی بنک میں جمع دولت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وہ موسم گرما میں اعظم گڑھ جانے کا شوقین تو تھا ہی، ادھر خان صاحب بھی وہاں جاتے رہتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس مرتبہ خان صاحب خالدہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ سردار احمد خان کے دوست کو یہ بات معلوم ہو گئی۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ترکیب آئی کہ کیوں نہ اپنے منصوبے پر اعظم گڑھ کی پہاڑیوں پر عمل کیا جائے۔ وہاں شہر کا ہنگامہ نہیں ہوگا۔ پرسکون جگہ پرسکون سے کام ہو جائے گا۔ سوچا اس نے یہ تھا کہ خالدہ کی انگلی سے کسی طرح انگٹھی حاصل کر لی جائے۔ اعظم گڑھ پہنچ کر اس نے مون لائٹ ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۵ میں قیام کیا۔ اس ہوٹل میں تین بد معاش انور، رشید اور شریف روزانہ آتے تھے۔ اسے کسی نے انکے بارے میں بتایا۔ یہ انہیں اپنے کمرے میں لے گیا اور انہیں اس کام پر آمادہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح خالدہ کی انگلی سے انگٹھی اتار لائیں، اس کے بدلے وہ انہیں پچیس ہزار روپے دے گا۔ تینوں بہت حیران ہوئے۔ ایک انگٹھی کے بدلے پچیس ہزار کی رقم حیران کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن انہیں تو پچیس ہزار روپے حاصل کرنے کی پڑ گئی تھی۔ اس لئے انہوں نے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ سردار احمد کے دوست نے انہیں اس کوٹھی کا پتا بھی بتایا تھا جس میں خان صاحب رہا کرتے تھے اور خالدہ کا حلیہ بھی انہیں بتایا۔ تینوں اس کوٹھی کے آس پاس منڈلانے لگے۔ دوسرے دن انہیں خالدہ گھر سے نکلتی نظر آئی۔ وہ سمجھ گئے کہ لڑکی یہی ہے۔ انہوں نے اس کی انگلی میں انگٹھی بھی دیکھ لی تھی۔ وہ احتیاط سے خالدہ کا تعاقب کرنے لگے۔ خالدہ سیر کی غرض سے نکلتی تھی۔ جب یہ کوٹھی سے کافی دور پہاڑیوں کے درمیان پہنچ گئی تو انہوں نے اسے رکنے کے لئے کہا۔ خالدہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھی۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ یہی وہ منظر تھا جو فرزانہ نے دور بین میں دیکھا تھا اور وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ لوگ شاید آنکھ پھولی کھیل رہے ہیں۔ انہوں

نے خالدہ کو پکڑ لیا اور انگٹھی اس کی انگلی سے اتار لی، لیکن اتنی دیر میں یہ تینوں وہاں پہنچ گئے اور ان میں سے ایک کے ایک پتھر دے مارا۔ یہ بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگے۔ ادھر میں بھی دور بین سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، جب میں نے انہیں انگٹھی نکالتے ہوئے دیکھا تو میں بھی بھاگ کھڑا ہوا اور راستہ کاٹ کر ان کے سامنے آ گیا۔ میں نے کرائے کے مکان کے بارے میں پوچھنے کے بہانے شریف سے ہاتھ ملایا اور انگٹھی اس کی جیب سے اڑالی۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ اس کے بعد ان کے بجائے میں ہوٹل مون لائٹ میں ہیٹ والے سے ملنے گیا جو کہ سردار احمد کا دوست ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ ہیٹ اوڑھے ہوئے اور صینک لگائے ہوئے تھا۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ اسنے مجھ پر پستول تان لیا اور پھر کسی نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔

بہر حال وہ مجھ سے انگٹھی حاصل نہ کر سکا۔ وہ شروع سے آخر تک میرے پاس ہی رہی۔ "یہ کہہ کر ایک بار پھر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

"بتا جان، آپ نے ابھی تک نہیں بتایا کہ اس دوست کا نام کیا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"میں اب اسی طرف آرہا ہوں۔ اکرام، اب تم پہلے ان تینوں کو لے آؤ۔ سمجھ گئے نا؟" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

جی ہاں، اچھی طرح سمجھ گیا۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کر اکرام گھر سے باہر چلا گیا۔

"آپ نے کن تینوں کو بلایا ہے؟" فاروق نے بے چین ہو کر کہا۔

"بس تھوڑی دیر صبر کرو۔"

وہ خاموش ہو گئے۔ سوچ رہے تھے کہ ابھی اکل اکرام ہیٹ والے کو لے کر آتے

مجرم کون

وہ انہیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انسپٹر جمشید نے ان تینوں کو بلایا ہے۔
 ”یہ ہیں وہ تین بد معاش جنہوں نے خالدہ کی انگلی سے انگلی نکالی تھی اور اب ان تینوں سے ایک سوال کرتا ہوں۔“
 ”یہ کہہ کر وہ ان کی طرف مڑے۔ تینوں ابھی تک ڈرائنگ روم کے فرش کے پتھروں پر کھڑے تھے۔
 ”میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہوٹل مون لائٹ کے کمرہ نمبر ۳۵ میں تمہیں جو ہیٹ والا ملا تھا، اس کمرے میں موجود وہ کون سا شخص ہے۔“
 ”کیا؟“ ان سب کے منہ سے نکلا۔
 ”تو کیا۔ وہ ہیٹ والا اس وقت کمرے میں موجود ہے۔“ فاروق نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔
 ”وہ ہیٹ والا کمرے میں نہیں ہے۔“ انور کے منہ سے نکلا۔ تینوں سب کو بغور دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں اس وقت چونکہ دو تین ایسے آدمی بھی تھے جنہیں انہوں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے محمود، فاروق اور فرزانہ کی نظریں زیادہ تر ان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ضرور ان میں سے ایک مجرم ہے، مجرم جو خالدہ

ہوں گے۔ اچانک خان صاحب بولے:

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے۔“
 ”کیا آپ نہیں چاہتے کہ خالدہ کی دولت کو ہتھیالینے کی کوشش کرنے والا گرفتار ہو جائے؟“

”ضرور چاہتا ہوں، لیکن وہ کہاں ہے۔ آخر آپ کے گرفتار کر رہے ہیں؟“ خان صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

”ابھی چند منٹ بعد سب کچھ آپ کے سامنے ہوگا۔“

”اور میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“ راجہ عزیز احمد وکیل نے پوچھا۔

”آپ سرار احمد خان کے وکیل رہے ہیں، آپ کی موجودگی بھی ضروری تھی۔“ انسپٹر جمشید یہ کہتے وقت مسکرائے۔

اسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے خالدہ، محمود فاروق اور فرزانہ بی طرح چوٹے۔

اکرام کے ساتھ جو تین آدمی اندر داخل ہوئے، وہ انور، رشید اور شریف تھے۔

☆☆☆

جان بوجھ کر لڑکھڑائے تھے۔
وہ سب بھونچکے رہ گئے۔ اسی وقت انور، رشید اور شریف ایک ساتھ چپے:

”وہ ہیٹ والا یہی تھا۔“

”کیا؟“ ان سب کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

”ہاں، ان تینوں کو راجہ عزیز احمد نے ہی انگوٹھی حاصل کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ یہی تھے جو ہیٹ اور عینک لگا کر ان سے ملے تھے اور پھر مجھ سے بھی ملاقات کی تھی، انہوں نے ہی خالدہ کی دولت پر قبضہ جمانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کیونکہ یہ سردار احمد کے دوست، بھی تھے اور ان کے وکیل بھی تھے۔ یہی وہ دوست ہیں، جنہیں سردار احمد نے نیروبی کا راز بتا دیا تھا کیونکہ انہیں ان پر اعتبار تھا۔ اگر انہیں اعتبار نہیں تھا تو خان صاحب پر، اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ دراصل خان صاحب تو بہت ہی زیادہ ایماندار واقع ہوئے ہیں اور خالدہ کو باپ کی طرح آج بھی چاہتے ہیں اور اپنے بھائی کی زندگی میں بھی چاہتے تھے جب کہ سردار احمد ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ یہی ہے وہ مجرم۔ جس نے یہ سارا چکر چلایا۔“

”یہ غلط ہے، مجھ پر سراسر بہتان ہے۔ میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

راجہ عزیز نے چلا کر کہا۔

”یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے؟“ اس نے پھر چیخ کر کہا۔

”بغیر ثبوت کے تو میں کبھی کسی مجرم کو پکڑا ہی نہیں کرتا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، اسے ثابت کر دوں گا۔“

”تم کبھی بھی عدالت میں یہ بات ثابت نہیں کر سکو گے کہ وہ ہیٹ والا میں تھا۔“

راجہ عزیز نے غر کر کہا۔

کے والد کا دوست تھا۔

”ہاں، رشید، تم کیا کہتے ہو؟“ ان سب میں وہ ہیٹ والا موجود ہے یا نہیں۔
”جی نہیں، ان میں وہ موجود نہیں ہے۔“

”شریف، تمہارا کیا خیال ہے؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہیٹ والا یہاں موجود نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔
”اچھی بات ہے۔ محمود، میرے کمرے کی الماری میں ایک ہیٹ اور ایک عینک

موجود ہے، ذرا وہ اٹھا لاؤ۔“

”جی اچھا۔“ محمود نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ہیٹ اور عینک تھے۔

انسپکٹر جمشید نے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے لیں اور اپنی جگہ سے اٹھ

”اب میں ایک شخص کے سر پر یہ ہیٹ اور آنکھوں پر عینک لگاؤں گا۔ تم غور سے دیکھ کر بتانا۔ آیا وہی تم سے مون لائٹ ہوٹل کے کمرے میں ملا تھا؟“

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید ٹہلنے کے انداز میں ان تینوں آدمیوں کی طرف بڑھے جنہیں وہ نہیں جانتے تھے۔ سب کی نظریں ان پر جم گئیں۔ دل دھک دھک کرنے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ نہ جانے ان تینوں میں سے ہیٹ والا کون ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوئی کہ وہ تینوں پر سکون انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر جمشید کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر بھی ان کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔

انسپکٹر جمشید چلتے چلتے اچانک لڑکھڑائے۔ انہوں نے خود کو گرنے سے بچانے کے لئے راجہ عزیز احمد کا سہارا لیا اور پھر اچانک ان سب نے دیکھا ہیٹ اور عینک راجہ عزیز احمد لگائے ہوئے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے بجلی کی سی تیزی سے یہ کام کیا تھا۔ وہ

”تم خوش فہمی میں مبتلا ہو، میں تو اسی وقت یہ بات ثابت کر دوں گا۔ میں جان ہوں، تم وکیل ہو اور بہت چالاک بھی، اس لئے میں نے پہلے ہی تمہارا پکا بندہ دست کر رکھا ہے۔“ یہ کہہ کر انسپٹر اکرام کی طرف بڑھے۔

”اکرام، اب تم اسے بھی لے آؤ۔“

”جی بہت اچھا۔“ اس نے کہا اور ایک بار پھر باہر نکل گیا۔ جب وہ دوبارہ اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ اسے دیکھ کر چونک اٹھے۔ انہوں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا تو ضرور تھا لیکن یاد نہ آ سکا کہ کہاں دیکھا تھا:

”ارے، اس آدمی کو تو ہم نے کہیں دیکھا ہے۔“ محمود کے منہ سے نکلا۔

”ہاں، دیکھا تو ضرور ہے۔ لیکن یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ کہاں دیکھا ہے۔“ فاروق بولا۔

”میری بھی عقل حیران ہے۔“ فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

”سوچو، ذہن پر زور دو۔ یہ کون ہے۔ تم نے اسے کہاں دیکھا ہے۔“ انسپٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

اچانک فرزانہ کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ اس نے چلا کر کہا۔

”اوہ، مجھے یاد آ گیا ہے۔ یہ تو انوار بیگ ہے۔“

”ارے ہاں، ہوٹل مون لائٹ کا مالک۔“ محمود کے منہ سے نکلا۔

”بالکل ٹھیک سمجھے۔ ہاں تو مرزا صاحب، تم اس ہیٹ اور عینک والے کو دیکھ رہے ہو، کیا یہ وہی ہے جو تمہارے ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۵ میں ٹھہرا تھا۔“

”جی۔“ مرزا انوار بیگ نے بوکھلا کر کہا۔

”پہچانو اسے۔ یہ وہی ہے نا۔“

”جی۔ جی ہاں، وہی ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”لہجے راجہ صاحب، یہ آپ کے خلاف دوسرا ثبوت ہے۔“ انسپٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

”اس کی گواہی سے بھی کچھ نہیں بنے گا۔ میں جانتا ہوں، تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ راجہ عزیز نے پُر غرور لہجے میں کہا۔

”تو تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہارے خلاف ان دو ثبوتوں کے ہوتے ہوئے تم پر مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا۔“ انسپٹر جمشید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں ایک وکیل ہوں۔ سرکاری کیس کی دہجیاں اڑا دوں گا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”میرا بھی یہی خیال تھا کہ شاید میں اس طرح تمہیں سزا نہیں دلا سکوں گا۔“ انسپٹر جمشید نے مایوس ہو کر کہا۔

”ہا ہا ہا۔ تم ہار گئے۔ میں جیت گیا۔ تمہاری ساری عقل مندی اور ہوشیاری دھری رہ گئی، تمہیں میرے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے یہ ضرور سوچ لینا چاہیے تھا کہ

میں ایک چوٹی کا وکیل ہوں اور تمہارے قابو میں اتنی آسانی سے نہیں آؤں گا۔“ اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

”واقعی، میں نے بہت بڑی غلطی کی۔“ انسپٹر جمشید بے چارگی سے بولے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں حیران ہو کر دیکھا، کیونکہ انہوں نے آج تک اس قسم کے موقعوں پر انہیں دل ہارتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو جب بھی کسی مجرم پر ہاتھ

ڈالتے تھے، خوب سوچ سمجھ کر ڈالتے تھے، اس طرح کہ مجرم کسی طرح بچ نہ سکے۔

”تو پھر مجھے اجازت دو، تم نے مجھے بلاوجہ ہی تکلیف دی۔“ راجہ عزیز نے کہا۔

”جی ہاں، مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن ایک بات رہی جاتی ہے۔“ اچانک انسپٹر

جشید بولے۔

”کیا مطلب؟“ کون سی بات رہی جاتی ہے۔“

”ہوٹل مون لائٹ کے کمرہ نمبر ۳۵ میں انگلیوں کے کچھ نشانات ملے ہیں، جو آپ کی انگلیوں کے ہیں۔“

”بالکل غلط۔ میں تو وہاں ہاتھوں پر دستانے پہن کر گیا تھا۔“ راجہ عزیز کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

”بہت خوب۔ تو آپ وہاں گئے تھے اور دستانے پہن کر گئے تھے۔“ انسپکٹر جشید مسکرائے۔

”میرے یہ کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں یہ بیان عدالت میں تو نہیں دے رہا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”اکرام، راجہ عزیز کو گرفتار کرلو۔“ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے ہوٹل مون لائٹ کے کمرہ نمبر ۳۵ میں ہاتھوں پر دستانے پہن کر گئے تھے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے گہرا کر کہا۔

مطلب یہ کہ اس کمرے میں آپ نے جو گفتگو کی ہے، وہ سب کی سب ٹیپ ہو چکی ہے۔ اب کہئے وکیل صاحب، کیا خیال ہے؟“ انسپکٹر جشید مسکرا کر بولے، پھر اکرام کی طرف مڑے۔

”اکرام، تم نے سنا نہیں، انہیں گرفتار کرلو۔“

”جی بہت بہتر۔“ اکرام نے کہا اور جھکڑیاں لے کر عزیز کی طرف بڑھا۔

پھر سب چونک کر رہ گئے۔ ایک گرج دار آواز کمرے میں گونجی تھی:

”خبردار، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی انہیں راجہ عزیز کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک پستول نظر آیا۔ ”اپنے ہاتھ ادا پراٹھا لو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ نال کا رخ ان سب کی طرف ہو گیا۔ پورے کمرے میں اس کی نظریں گردش کر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ سب ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ راجہ عزیز ان پر پستول بھی تان سکتا ہے۔

”بہت خوب، یہ ہوئی تاباں بات۔ تم نے اپنے مجرم ہونے کا ایک اور ثبوت دے دیا ہے۔“ انسپکٹر جشید کا جملہ جیسے ان سب کو ہوش و حواس کی دنیا میں لے آیا۔

”خاموش، کوئی کچھ نہ بولے۔ ورنہ میں بے دریغ فائرنگ کر دوں گا۔“ اس نے غزا کر کہا۔

”بہت خوب، یہ ہوئی تاباں بات۔ ہمارے ہی گھر میں اور ہمیں ہی میاؤں۔“ فاروق مسکرایا۔

”میرے ہاتھ میں کوئی کھلونا نہیں۔۔۔۔۔“

”پستول ہے۔“ محمود نے اس کا جملہ جلدی سے مکمل کر دیا۔ ”ہم اچھی طرح جانتے ہیں، یہ کھلونا نہیں ہے بلکہ پستول ہے۔ اس قسم کے پستولوں سے ہمارا پہلے بھی

واسطے پڑتا رہا ہے، اس لئے تم خواخوہ میں ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔“

”بکومت، تم بہت بد تمیز ہو، خیر، میں پھر کسی موقع پر تم تینوں سے سمجھوں گا۔ میں اب جا رہا ہوں۔ اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو گولی سے اس کا سراڑا دوں گا۔“ اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تم واقعی جا رہے ہو؟“ فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

”نہیں، یہ تو یونہی مذاق کر رہا ہے۔ یہ یہاں سے کہا جائے گا۔“ محمود کے منہ سے نکلا۔

”نہری بات ہے، بڑوں سے اس انداز میں گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو دراصل

ہمارا دل بہلا رہے ہیں۔" فرزانہ نے ان دونوں کو ڈانٹا۔

راجہ عزیز نے ان تینوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔ پھر دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ اسی وقت محمود کا ہاتھ نیچے جھک گیا اور جیب میں ریگ گرا۔

راجہ عزیز نے گرج کر کہا:

"خبردار، ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔"

لیکن اتنی دیر میں محمود جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔

"بے فکر ہو، میری جیب میں کوئی پستول نہیں ہے۔ ہم اس قسم کے خوف ناک چیزیں جیبوں میں نہیں رکھتے اور وہ بھی اپنے ہی گھر میں۔ دراصل تم نے گولی مارنے کی دھمکی دی تو مجھے مٹائی کی گولی یاد آ گئی۔ یہ دیکھو، میرے ہاتھ میں تو صرف ایک مانی ہے۔ اب تم کہو تو میں اسے کھالوں۔"

"بکواس نہ کرو۔" اس نے چلا کر کہا۔ ویسے اس کے ہاتھ میں مانی دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

"جی بہت اچھا، نہیں بکتا۔ لیکن مانی تو کھا سکتا ہوں نا۔"

"پھر بولے تم۔ اگر مجھے جانے کی جلدی نہ ہوتی تو میں ضرور تمہیں اس بد تمیزی کا مزہ چکھاتا۔"

"تو آپ کو جلدی ہے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتا دیا۔"

محمود نے یہ کہتے وقت مانی کا کاغذ اتارنا شروع کر دیا۔ راجہ عزیز نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ دوسری طرف محمود برابر کہے جا رہا تھا:

"مجھے افسوس ہے، اس وقت میرے پاس کوئی اور گولی نہیں ہے؛ ورنہ میں ایک گولی تمہیں بھی ضرور دیتا۔ چلو تم یہی گولی کھالو، میں تو کھاتا ہی رہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی محمود نے مانی اس کی طرف اچھال دی۔ راجہ عزیز نے اس کی طرف

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ تو دروازے کی طرف چل رہا تھا۔ اچانک مانی اس کے

پیروں کے پاس گری اور ایک زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ گئی۔

اس کے منہ سے ایک بھیاٹک چیخ نکلی۔ پستول اچھل کر کمرے کے ایک کونے

میں جا گر اور وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے چلانے لگا

"آف اللہ! یہ میری آنکھوں کو کیا ہوا۔ ہائے میں مرا۔ ارے ظالم یہ کیا کیا۔"

"جی کیا کیا۔ ظالم۔ لیکن میں نے کیا کیا ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"آف۔۔۔ میری آنکھیں۔۔۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔۔۔ میں اندھا ہو جاؤں گا۔"

اس نے چیخ کر کہا۔

"تم بھی تو اپنے پستول کی گولیوں کی بات کر رہے تھے۔ میرے پاس تو ایسی اور

بھی گولیاں ہیں۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"خدا کے لئے کچھ کرو۔"

"کیا تو بہت کچھ جاسکتا ہے، لیکن پہلے صاف لفظوں میں اقرار کرو کہ یہ سب چکر

چلانے والے صرف تم تھے۔ صرف اسی صورت میں ہم کچھ کر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جشید

بولے۔

"ہاں، میں اپنا جرم ماننا ہوں۔ میں نے اپنے دوست کی بیٹی کی دولت کو ہڑپ

کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ میں ہی تھا جو اعظم گڑھ میں مون لائٹ ہوٹل کے کمرہ نمبر

۳۵ میں ٹھہرا تھا۔ میں نے ہی انور، رشید اور شریف کو انگٹھی حاصل کرنے پر لگایا تھا۔

ان تینوں نے میرے لیے کام کیا اور بعد میں میری مدد کی۔ انہوں نے ہی مجھے فون پر

اطلاع دی تھی کہ انگٹھی آپ کے پاس ہے، انہوں نے آپ کی کوشی کا پتا بھی بتایا تھا۔

میں وہاں پہنچا، آپ کی بیگم کو باندھ کر کوشی کی تلاش لی لیکن انگٹھی وہاں بھی نہ مل سکی۔

میں یہ سب تسلیم کرتا ہوں۔ اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں، میری آنکھوں کا کچھ کرو۔"

”ہاں ضرور۔ اکرام پانی کا ایک گلاس لے کر ان کی آنکھوں میں پھینٹے مارو۔“

”نیک ہو جائیں گے۔“

”جی اچھا۔“ اکرام بولا۔

رہبر عزیز کی آنکھوں میں جونہی پانی لگا، وہ پرسکون ہو گیا۔ یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اتنی دیر میں اکرام اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب اطمینان سے بیٹھے اس کیس پر باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت انسپٹر جمشید نے ان تین آدمیوں کے بارے میں بتایا۔ وہ دراصل بینک کی غیر ملکی شاخ کے آفیسر تھے۔ انسپٹر جمشید نے نیردبی میں بینک کے منیجر کو سارے حالات لکھ بھیجے تھے اور اس نے ان کے ملک میں موجود بینک کے آفیسروں کو بطور گواہ انسپٹر جمشید کی ہدایات پر عمل کرنے کی تاکید کی تھی۔ باتوں کے دوران فاروق نے یہ سوال اٹھایا: ”تاجان، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ انگوشی تو سرار احمد خان کی تھی لیکن خالدہ کی انگلی میں اتنی تنگ کیوں تھی؟“

”اچھا سوال ہے۔“ انسپٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔ ”محمود، کیا تم اس کی وجہ بتا سکتے ہو۔ آخر انگوشی خالدہ کی انگلی میں تنگ کیوں ہے؟“

”جی، اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ خان صاحب نے انگوشی خالدہ کو دینے سے پہلے چھوٹی کرا دی ہوگی۔“

انسپٹر جمشید کو ہنسی آگئی۔ آخر انہوں نے کہا: ”فرزانہ تم کیا کہتی ہو؟“

”خالدہ کے والد انگوشی کو چھوٹی انگلی میں پہنتے ہوں گے، اس لئے وہ خالدہ کی درمیانی انگلی میں فٹ آگئی ہوگی۔“

”ادھ۔“ محمود اور فاروق کے منہ سے نکلا۔

”اچھا یہ بتائیے، آپ کو نیردبی کے حالات کس طرح معلوم ہو گئے؟“ فرزانہ نے وہاں کے محکمہ سرانفرسانی کے ایک انسپٹر کو تار دیا تھا۔ وہ میرا دوست بھی ہے۔ اس نے تمام معلومات حاصل کیں۔ بینک جا کر منیجر سے بھی ملا۔ اسے سارے حالات بتائے، اسکے بعد کل حالات کا جان لینا میرے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ مون لائٹ ہوٹل میں رہبر عزیز کو ہیٹ والے کی شکل میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس وقت ناک اور تھوڑی کو غور سے دیکھا تھا۔ پھر جب میں اس سے ملنے کے لئے اس کے دفتر گیا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہیٹ والا یہی ہے۔“

”بہت خوب۔ تو یہ کیس ختم ہوا۔“ خان صاحب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اب وہ انگوشی میں خان صاحب کے حوالے کرتا ہوں، تاکہ جب خالدہ بڑی ہو جائے تو وہ اسے نیردبی لے جائیں اور اس کا حق اسے دلا دیں۔ یوں بھی خان صاحب اس بھری دنیا میں تنہا ہیں۔ انہیں خالدہ کی دولت ہتھیانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ انسپٹر جمشید نے کہا۔

”بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آپ ہی انگوشی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ آپ اس کی مجھ سے بہتر حفاظت کر سکتے ہیں۔“ خان صاحب نے رائے پیش کی۔

”نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے۔“ انسپٹر جمشید نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔

”میں بہت سنجیدگی سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں اس انگوشی کی حفاظت نہ کر سکوں۔ اس لیے کیوں نہ آپ ہی اسے اپنے پاس رکھ لیں۔“ خان

صاحب نے کہا۔

”تو پھر ایسا کرتے ہیں، اسے کسی بینک میں محفوظ کر دیتے ہیں۔“ آخر کار

جسید نے نئی تجویز پیش کی۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ خان صاحب خوش ہو کر بولے۔

”لیکن اس کیس میں ہمیں کیا ملا۔“ فاروق نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”فکر نہ کریں میں تم تینوں کو پوری ایک سو سونے کی انگوٹھیاں تحفے کے طور پر دوں

گی۔“ خالدہ نے مسکرا کر کہا۔

”ایک سو انگوٹھیاں۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔ ”بھلا اتنی انگوٹھیوں کا ہم کیا

کریں گے۔“

”ہاں اور کیا، اگر ہم ہر انگلی میں ایک ایک بھی پہنیں تو دس دس کافی ہوں گی۔ اس

طرح بھی کل تیس انگوٹھیوں کی ضرورت ہوگی۔“ فرزانہ بول پڑی۔

”اور اگر بیروں کی انگلیوں میں بھی پہنیں تو اس صورت میں ساٹھ انگوٹھیوں کی

ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”اور پھر سو انگوٹھیوں کو ہم برابر تقسیم بھی تو نہیں کر سکیں گے۔“ فاروق نے کہا جس

پر ایک قہقہہ لگا۔

☆☆☆

انگوٹھی والے کیس کو حل ہوئے چھ ماہ گزر گئے۔ محمو، فاروق اور فرزانہ ہر روز سوچتے۔۔۔ کیا شہر کے سب جرائم پیشہ تو بہ کر چکے ہیں۔ پھر انہی دنوں ان کے امتحانات شروع ہو گئے۔ وہ امتحانات سے فارغ ہوئے تو پروفیسر داؤد نے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ دوسری طرف خان رحمان کی ضد تھی کہ وہ یہ چھٹیاں ان کے گھر گزاریں گے۔ معاملہ دو مٹاؤں کے درمیان مرغی حرام والا تھا۔ آخر اس کا فیصلہ

پروفیسر جسید پر چھوڑا گیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ پہلے ایک ہفتہ تینوں پروفیسر داؤد کے پاس رہیں گے اور پھر ایک ہفتہ خان صاحب کے ہاں۔ اس فیصلے کو منظور کر لیا گیا۔ تینوں پروفیسر انکل کے ہاں پہنچے تو انہوں نے راز دار شاعرازم میں کہا:

”کیا تم جانتے ہو، میں نے تمہیں یہاں آنے کی دعوت کیوں دی ہے؟“

”جی، کیا مطلب؟“ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔“ فاروق نے حیران ہو کر

کہا۔

”ہاں، میں ان دنوں شیشے کے بکس والے فارمولے پر کام کر رہا ہوں۔“

”شیشے کا بکس۔“ ایک ساتھ ان کے منہ سے نکلا۔

☆☆☆

اٹلانٹس
پبلکیشنز

D-83 سائٹ۔ کراچی

فون: 2581720 - 2578273

e-mail: atlantis@cyber.net.pk